ڈاکٹر عبادت بریلوی
غزالانِ رعنا
اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

غزالانِ رعنا

اِدارہ ادبؔ و تنقید ○ لاہور

تصنیف : غزالانِ رعنا

مُصنّف : پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی

ناشر : فرحان عبادت ڈپٹی ڈائریکٹر
لٹریری ہسٹری پروجیکٹ، ادارۂ ادب وتنقید لاہور

سرورق : سیدانور حسین شاہ نفیس رقم لاہور

کتابت : سید محمد ابراہیم خوشنویس جامعہ اشرفیہ لاہور

اہتمام طباعت واشاعت : سید محمد ابراہیم جامعہ اشرفیہ لاہور

مطبع : ندیم یونس پرنٹر لاہور

تعاون : اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

تاریخ اشاعت : جون ر ۱۹۹۰ء

قیمت : -/۷۵ روپے

★

انتساب

★

★ گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ

★ اینگلو عربک کالج دہلی

★ اورینٹل کالج لاہور

★ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن

★ لکھنؤ یونیورسٹی

★ دہلی یونیورسٹی

★ پنجاب یونیورسٹی

★ لندن یونیورسٹی

اور

★ انقرہ یونیورسٹی

کی

یاد میں

جن کی آغوش میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، جہاں میں نے تدریس و تحقیق کا کام کیا، اور جہاں مجھے ایسے رفقائے کار اور یارانِ نکتہ دان ملے جن کی رفاقت، شفقت اور محبت میرے لئے باعثِ افتخار رہے۔

عبادت بریلوی

صبا بہ لطف بگو آں غزالانِ رعنا را
کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادۂ ما را
حافظؒ

فہرست

۴

۵

پیش لفظ

میں اس اعتبار سے ایک خوش قسمت انسان ہوں کہ مجھے ایک طالب علم اور اُستاد کی حیثیت سے اعلےٰ درجے کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے اور تدریس و تحقیق کا کام کرنے کے مواقع ملے۔ اِن اداروں میں ایسے لوگوں سے میرا تعلق رہا جن کی زندگیاں محبت اور شفقت سے عبارت تھیں۔ اور جو عظیم انسان تھے۔ میں اِن سے متاثر ہوا، اور میں نے اِن سے زندگی کو خوبصورت بنانے اور اس کو بسر کرنے کے آداب سیکھے۔

اس کتاب "غزالانِ رعنا" میں ایسے ہی بعض ساتھیوں، دوستوں اور بزرگوں کی شخصیتوں کے خاکے ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک تعلیمی، علمی، ادبی تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے برگزیدہ خصوصیات کا مالک تھا۔ اس لئے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اِن کی شخصیتوں کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے تاکہ پڑھنے والے اِن کے بنائے ہوئے راستوں پر گام زن ہوں، اور اُن کے ہاتھوں انسانی زندگی کو خوبصورت بنانے کا کام انجام پائے۔

غزالانِ رعنا میں جن احباب کی شخصیتوں کے خاکے شامل ہیں، اُن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں بڑے اہم کارنامے انجام دیئے، اور اپنے فکر و عمل سے انسانی زندگی کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اِن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ روشنی کا ایک مینار نظر آتا ہے۔

گذشتہ چند سال سے میں اس دور کی ایسی اہم شخصیات پر کام کر رہا ہوں جن سے اس حیاتِ مستعار میں میرا رابطہ رہا ہے۔ اِن شخصیات کے خاکوں کے جو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، اُن میں (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴) یارانِ دیرینہ اور (۵) بلاکشانِ محبت قابلِ ذکر ہیں۔

'غزالانِ رعنا' اس سلسلے کا چھٹا مجموعہ ہے جو اس وقت شائع کیا جا رہا ہے۔ اِن کے علاوہ چار مجموعے (۱) آہوانِ صحرا (۲) شجر ہائے سایہ دار (۳) خوش نوایانِ چمن (۴) شوریدگانِ شوق (۵) رندانِ بادہ کش اور (۶) یارانِ طریقت۔ طباعت و اشاعت کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ یہ مجموعے بھی انشاء اللہ جلد شائع ہو جائیں گے۔

شخصیات کے اِن خاکوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بُنیاد جذب و شوق پر استوار ہے اور ان میں اسلامیانِ پاکستان و ہند کی زندگی، ان کی معاشرت اور تہذیب سے متعلق ایسا نیا اور اچھوتا مواد ہے جس سے اس دور کی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی کے خد و خال، اس کے معاملات و مسائل، اور اُس کے رُجحانات و میلانات کی ان گنت تصویریں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

اس کام میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ تو میرے پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو ان شخصیات کے خاکوں کو دیکھ کر اصغر گونڈوی کے یہ اشعار پڑھتا ہوں اور ان کی پہلو دار معنویت پر سر دُھنتا ہوں ؎

یہ عشق نے دیکھا ہے، یہ عقل سے پنہاں ہے ۔۔۔ قطرے میں سمندر ہے ذرّے میں بیاباں ہے

پھر گرمِ نوازش ہے ضو مہرِ درخشاں کی ۔۔۔ پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا، اپنا ہی گریباں ہے

عبادت بریلوی

۲۱-سی، یونین پارک، سمن آباد لاہور
۲۵ / مارچ ۱۹۹۰ء

سیّد آغا حسن عابدی

سیّد آغا حسن عابدی میرے بچپن کے ساتھی ہیں، میرے کلاس فیلو اور عزیز دوست ہیں۔ وہ اسکول کی ابتدائی جماعتوں سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک میرے ساتھ رہے۔ خاصا عرصہ ہم نے ایک دوسرے کی معیت میں گذارا۔ وہ وہ ایک دلکش و دلآویز شخصیت کے مالک ہیں۔ اور ایک ایسے جاذب نظر انسان ہیں کہ اِس زمانے میں چراغ لے کر ڈھونڈا جائے تو ایسا انسان اِس دُنیا میں نہیں مِل سکتا۔ خوبصورت، خوش ادا، مُہذّب، شائستہ، بلند اخلاق، دُھن کے پورے، کام کے پکّے۔ دوستوں کے دوست، دُشمنوں کے بھی خواہ، انسان دوست، دردمند، مُخلص، بُردبار، جذب صادق رکھنے والے، ہر ایک کی مدد کرنے والے، محبت اور جذب و جُنوں کی دولت بیش بہا سے مالا مال ——— میں نے زندگی میں ایسی خوبیوں کا انسان کوئی دوسرا نہیں دیکھا ——— بلکہ انسان کے رُوپ میں اُن کو فرشتہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔

میں جب گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کے پانچویں درجے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جس کلاس فیلو سے میری مُلاقات ہوئی وہ آغا حسن تھے۔ اتفاق سے سیٹ بھی مجھے ایسی مِلی جو آغا حسن کے بالکل برابر تھی۔ اس لئے اُن سے یہ پہلی

مُلاقات بہت جلد دوستی میں اور بقول آغا حسن "جگری دوستی" میں تبدیل ہوگئی۔ اسکول کی جماعتوں اور پھر کالج کی جماعتوں میں کئی سال تک میرا اُن کا ساتھ رہا۔ اس زمانے میں ہم دونوں ایک ساتھ کلاسوں میں بیٹھتے، ایک ساتھ پڑھتے لکھتے، ایک ساتھ کھیلتے کودتے، ایک ساتھ تفریح کرتے، ایک ساتھ سینما جاتے۔ فلمیں دیکھتے، دریا کی سیر کرتے، بازاروں میں گھومتے، ایک دوسرے کے گھر جاتے۔ غرض خاصی گاڑھی چھنتی تھی۔ آغا حسن کے ساتھ دوستی کا یہ تعلق ایسا تھا کہ ہم دونوں کو ایک جان دو قالب کہا جائے تو بے جا نہیں۔

جب ہماری دوستی کا آغاز ہوا تو اُس وقت ہماری عُمریں نو دس سال سے زیادہ نہیں تھیں یعنی ہم لوگ صحیح معنوں میں بچّے تھے۔ ہمارے گھروں کا ماحول ایک جیسا تھا۔ ہمارے والدین کی شفقت ہم پر بے پایاں تھی۔ نازو نعم اور لاڈ پیار میں ہم لوگ زندگی کے دن گُذارتے تھے۔ میرے والدین آغا حسن کا بہت خیال رکھتے تھے اور آغا حسن کے والدین مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ غرض خاصے عرصے تک ہم دونوں سگے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔

لکھنؤ میں میرا مکان ہماری درس گاہ جوبلی کالج کے قریب ڈیوڑھی آغا میر میں تھا۔ صرف پانچ منٹ میں میں کالج پہنچ جاتا تھا۔ کالج کی عمارتیں، اور اس کے کشادہ میدان ہمارے مکان کی تیسری منزل سے صاف نظر آتے تھے۔ آغا حسن کا آبائی مکان ڈیوڑھی آغا میر سے مُتصل محلہ پاٹے نالے میں تھا۔ پانچ سات منٹ میں ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ روز کا مِلنا جُلنا تھا۔ کالج میں تو ہم لوگ ساتھ رہتے ہی تھے۔ شام کو بھی یا تو میں اُن کے ہاں چلا جاتا تھا یا وہ میرے ہاں آجاتے تھے۔ ہم لوگ گھنٹوں باتیں کرتے، کبھی ربڑ کی گیند سے کرکٹ کھیلتے اور کبھی یوں ہی اُچھلتے کودتے اور ایسے ہنگامے برپا کرتے کہ آس پاس کے لوگ پریشان ہو جاتے تھے۔

آغا حسن کا آبائی مکان قدیم طرز کا تھا اور اس میں گھر کی خواتین رہتی تھیں۔ اس

کے قریب ہی اُن کا ایک مردانہ مکان بھی تھا۔ جو بہت کشادہ تھا۔ اُس میں ہم لوگ دن دن بھر کھیلتے تھے۔ کچھ دوسرے کلاس فیلو منظور احمدؒ، مرزا کمال بیگ، صادق حسین، رضا حسین، ظہیر حیدر اور احمدؒ علی وغیرہ بھی یہاں آجاتے تھے۔ اُن کے ساتھ بھی اچھا وقت گذرتا تھا۔ آغا حسن کے والد صاحب ریاست محمود آباد میں تحصیل دار تھے، اور زیادہ تر ضلع سیتاپور کی تحصیل بھنڈیا میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی تھوڑے دنوں کے لئے وہ لکھنؤ آتے تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کو خاصی آزادی تھی۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ اس لئے ہم لوگ اُن کے مردانہ مکان میں خاصے ہنگامے برپا کرتے تھے۔ اتوار کو "چھٹی" ہوتی تھی۔ چھٹی کے دن ہم لوگ آغا حسن کے ہاں جمع ہوتے تھے، اور دن وہاں گذار کر شام کو اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے تھے۔

آغا حسن بچپن ہی سے بڑے جذب وکشش کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کیفیت تھی جو ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ کتابی چہرہ، گندمی رنگ، بوٹا سا قد، خوش پوش خوش لباس خوش گفتار، خوش اخلاق، مخلص، دیانت دار، صاف گو، ٹوٹ کر محبت کرنے والا، سادہ اور معصوم، —— بس اس کی شخصیت کی یہ خصوصیات تھیں جو ہر انسان کو اس کا گرویدہ بنا لیتی تھیں۔ میں بھی انہیں خصوصیات کی وجہ سے اس کا گرویدہ ہوگیا، اور اسی وجہ سے بچپن کے زمانے سے لے کر آج تک تقریباً پچاس سال ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گذارے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں تو چوبیس گھنٹے کا ساتھ رہا۔ لیکن اس کے بعد بھی جب ہم بڑے ہو کر بظاہر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے لیکن کسی نہ کسی صورت میں دوستی کا رابطہ بہر صورت باقی رہا۔

جب ہم جوبلی کالج کی اسکول کی جماعتوں میں ایک ساتھ پڑھتے تھے تو لکھنؤ میں قدیم تہذیبی روایات زندہ وتابندہ نظر آتی تھیں، اور ہم سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ہم لوگ زیادہ وقت گھروں میں گذارتے۔ باہر نکلتے تو کسی نہ کسی کو ساتھ لے کر جاتے۔ والدین کا کہنا مانتے، پڑوسیوں کی عزت کرتے اور اُن کی خدمت کو اپنا

فرض جانتے، محفلوں اور مجلسوں میں جاتے تو آداب محفل کا خاص خیال رکھتے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کے منہ نہیں لگتے۔ لیکن اُن کا احترام ضرور کرتے۔ گھروں سے شیروانی پہنے بغیر کبھی باہر نہ نکلتے۔ ہم جو لیوں تک سے ملتے تو پہلے آداب و تسلیمات کہہ کر اُن کا استقبال کرتے، اور زیادہ بے تکلف نہ ہوتے۔ ہمیشہ آپ، جناب کہہ کر باتیں کرتے۔ میں اور آغا حسن دونوں نے انہیں تہذیبی اور معاشرتی روایات کے سائے میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے ہم ان تمام باتوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔

آغا حسن صبح کو جب اپنے گھر سے اسکول کے لئے روانہ ہوتے تو لکھنؤ کے شرفاء کا پورا لباس پہن کر باہر نکلتے۔ لکھنؤ کی خاص وضع کی لمبی سی شیروانی اُن کے جسم پر اپنی بہار دکھاتی۔ بڑے پائنچوں کے لکھنوی انداز کے پائجامے پر اس شیروانی کا حُسن کچھ اور بھی دوبالا ہو جاتا۔ سر پر لکھنؤ کی خاص وضع کی کشتی نما ٹوپی ہوتی۔ گرمیوں کے موسم میں جامدانی یا سرج کی شیروانی کی جگہ کسی ہلکے کپڑے کی شیروانی اور سر پر لکھنؤ کی خاص طرح کی دوپلی ٹوپی پہنتے۔

اس وضع قطع سے آغا حسن اپنے پاٹے نالے والے گھر سے باہر نکلتے اور ڈیوڑھی آغا میر کی سڑک سے گذر کر جوبلی کالج پہنچتے۔ پیچھے پیچھے ایک بوڑھا ملازم اُن کی کتابیں اور بستہ وغیرہ لے کر چلتا، اور اپنی حفاظت میں کالج پہنچا کر گھر واپس چلا جاتا۔ کالج میں ساڑھے تین بجے جب چھٹی کا وقت ہوتا تو یہ ملازم پھر کالج آجاتا، اور آغا حسن کا سامان اُٹھا کر اپنی حفاظت کے سائے میں انہیں گھر پہنچاتا۔ کئی سال تک اُن کا یہ معمول رہا۔ جب انٹرمیڈیٹ میں پہنچے تو اس ملازم سے انہوں نے اپنا پیچھا چھڑایا، اور وہ بغیر اس ملازم کے کالج آنے جانے لگے۔

جب تک ہم لوگ جوبلی کالج کی اسکول کی جماعتوں میں رہے، میرا زیادہ وقت آغا حسن کے ساتھ گذرتا تھا۔ اسکول کی مختلف جماعتوں میں ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ ساتھ ساتھ پڑھتے لکھتے تھے۔ انٹرول ہوتا تھا تو ہم دونوں کالج کے پھل والے چندی کی دوکان پر جاتے تھے۔ کوئی نہ کوئی پھل اس سے خرید کر کھاتے

تھے ۔ اور اس سے باتیں بھی کرتے تھے ۔ چندی بھی خوب آدمی تھا ۔ ایک ایک طالب علم کو اچھی طرح جانتا تھا ۔ اس کی حیثیت کالج میں ایک ادارے کی تھی ۔ وہ کالج کے معاملات و مسائل پر تبصرہ بھی کرتا تھا ۔ سیاست کی باتیں بھی اس کے ساتھ ہوتی تھیں ۔ وہ کھیلوں کا بھی شیدائی تھا ۔ فٹ بال اور ہاکی کی ٹیموں اور اُن کے میچوں سے بھی اس کو گہری دلچسپی تھی ۔ چنانچہ وہ ان پر بھی اظہار خیال کیا کرتا تھا ۔ اُس کی باتیں اور تبصرے سُن کر اور اس سے باتیں کر کے ہم لوگ بڑی گراؤنڈ میں نیم کے گھنے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ جاتے تھے ، اور اُس کی ہریالی اور سائے سے لُطف اندوز ہوتے تھے ۔ یہاں ہمارے کلاس فیلو سید نور الحسن ، مرزا کمال بیگ ، ارشاد حسین خان ، اور کچھ دوسرے دوست اور سیّد صادق حسین وغیرہ بھی آ جاتے تھے ۔ اُن سے بھی باتیں ہوتی تھیں ۔ اس طرح انٹرول کا وقت گذار کر ہم لوگ پھر کلاسوں میں چلے جاتے تھے ۔ ساڑھے تین بجے جب چھٹی ہوتی تھی تو ہم دونوں ساتھ ساتھ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے ۔ میرا گھر کالج کے بالکل قریب تھا ۔ آغا حسن مجھے وہاں چھوڑ کر اپنے مُلازم کے ساتھ اپنے گھر چلے جاتے تھے ۔ شام کے وقت بھی وہ اکثر میرے ہاں آ جاتے تھے اور ہم لوگ کئی گھنٹے شام کو بھی ایک ساتھ گذارتے تھے ۔ انٹرمیڈیٹ تک ہمارا یہی معمول رہا ۔ لیکن شامت اعمال انٹر میں آغا حسن نے سائنس لے لی ، میں آرٹس میں چلا گیا ۔ اس طرح ہم بظاہر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے لیکن روزانہ مِلنا جُلنا ، باتیں کرنا ، ایک ساتھ کھانے پینے اور کھیلنے کودنے کا سلسلہ بہر حال جاری رہا ۔ دو سال پھر اسی طرح گزرے ۔ لیکن سائنس آغا حسن کے لئے مصیبت بن گئی ۔ دو تین سال تک انٹرمیڈیٹ پاس نہ کر سکے ۔ میں اس عرصے میں انٹرمیڈیٹ پاس کر کے یونیورسٹی میں چلا گیا ۔ نہ جانے کیا کیا جتن کر کے آغا حسن نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا ، اور وہ یونیورسٹی میں آ گئے ، میں اُس وقت ام ۔ اے میں پہنچ گیا تھا ۔ ہماری راہیں اس طرح بظاہر مختلف ہو گئی تھیں ۔ لیکن ہم لوگ معمول کے مطابق تقریباً روزانہ مِلتے جُلتے تھے ۔ گھروں پر بھی ایک دوسرے کا آنا جانا تھا ۔

اور پھر ہم لوگ کبھی کبھی آغا حسن کے ساتھ اُن کے والد صاحب کے پاس ریاست محمود آباد کی تحصیل بھنڈیا بھی جاتے تھے۔ یہاں ریاست کا ماحول تھا۔ آغا حسن کے والد یہاں بادشاہوں کی طرح رہتے تھے۔ بیسیوں نوکر ہم لوگوں کی خدمت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ انواع واقسام کے مُرغّن کھانے لکھنؤ سے آنے والے مہمانوں کے لئے دن دن بھر پکتے رہتے تھے۔ کئی تجربہ کار باورچی اس کام پر مامور تھے۔ دن کے وقت ہم لوگ میلوں سرسبز وشاداب کھیتوں میں سیر کرتے تھے۔ شام کو ٹینس اور بیڈ منٹن کھیلتے تھے۔ رات کو شاعری اور موسیقی کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں، اور ہم لوگ رات گئے تک ان محفلوں سے لُطف اندوز ہوتے تھے۔ دن عید معلوم ہوتا تھا اور رات شب برات۔ اور یہ سب کچھ آغا حسن اور اُن کے والد کی روایتی مہمان نوازی کی وجہ سے تھا۔

جب آغا حسن یونیورسٹی میں پہنچے اور اُنھوں نے بی۔ اے میں داخلہ لیا، اُس وقت میں غالباً ام۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ دو سال میں اُنھوں نے بی۔ اے پاس کیا، اور پھر ام۔ اے انگریزی میں داخل ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے ایل۔ ایل۔ بی میں بھی داخلہ لے لیا، اور یہ دونوں امتحان دو سال میں ایک ساتھ پاس کرلئے۔ اس زمانے میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے حبیب اللہ ہوسٹل میں رہتے تھے۔ گھر یونیورسٹی سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس لئے انھوں نے ہوسٹل میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں بھی اُن سے تقریباً روزانہ مُلاقات ہوتی تھی۔ کبھی میں ہوسٹل میں اُن سے مِلنے چلا جاتا تھا، کبھی وہ گھر پر آجاتے تھے۔ ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ میں کبھی گھر پر نہ ہوتا تو مایوس ہوتے اور ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک دن میرے ہاں آئے۔ میں نہ مِلا تو یہ تحریر چھوڑ گئے جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔

عُبادت! میں کل شام تمہارے گھر جا کر نا اُمید واپس آیا۔ تمہارے بھائی سے کہہ آیا تھا کہ آج صبح تم مجھ سے ضرور مل لینا۔ مجھے بہت

غصّہ اور تکلیف ہے کہ تم کیوں نہیں آئے۔ ۹ نمبر میں حبیب اللہ ہوسٹل میں آج سے کل دوپہر تک آکر مِل لو ورنہ خودکشی کر لوں گا۔"

تمہارا

آغا حسن

یہ خط دیکھ کر میں بہت پریشان ہوا۔ یہ سوچتا رہا کہ یہ جذباتی سا آدمی ہے۔ نہ جانے کون کون سے مسائل میں اُلجھا ہوا ہے۔ خدا جانے کیا کر بیٹھے۔ رات بڑی پریشانی کے عالم میں کاٹی۔ صبح کو سیدھا یونیورسٹی گیا۔ حبیب اللہ ہوسٹل پہنچا۔ دیکھا کہ کمرہ کُھلا ہوا ہے، لیکن آغا حسن غائب ہے۔ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں آغا حسن آئے۔ بہت برہم تھے۔

کہنے لگے "یار! تم عجیب آدمی ہو۔ کئی کئی دن گذر جاتے ہیں، تم سے مُلاقات نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہے کہ تمہارے گھر سے حبیب اللہ ہوسٹل کا فاصلہ چار پانچ میل سے کم نہیں ہے۔ لیکن میں مجبوراً یہاں رہتا ہوں۔ گھر سے روزانہ یونیورسٹی آنا مشکل ہے۔ سائیکل میں چلا نہیں سکتا۔ کوئی اور سواری ہے نہیں۔ گھر کے سب لوگ بھنڈیا (ریاست محمود آباد) میں والد صاحب کے ساتھ ہیں۔ میں اکیلا گھر پر کس طرح رہوں؟ لیکن تمہارے پاس تو سائیکل ہے۔ تم روزانہ میرے پاس آسکتے ہو۔ کیوں نہیں آئے؟ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ کوئی اُلجھن پیش آجائے تو مجھے شدّت سے تمہاری ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

اُس کی یہ باتیں سُن کر مجھے اُس پر بہت پیار آیا۔

میں نے کہا "میری جان! میں دو دن کے لئے لکھنؤ سے باہر چلا گیا تھا۔ والد صاحب مجھے لے گئے تھے۔ ایک ضروری کام تھا۔ اس لئے تم سے مُلاقات نہ ہو سکی۔ اب میں روزانہ تمہارے پاس آؤں گا۔ بتاؤ کیا بات ہے"

آغا حسن کہنے لگے "بات تو کوئی خاص نہیں ہے۔ کئی دن سے تم سے مُلاقات

نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے میں پریشان تھا۔ وحشت سی طاری ہوگئی تھی۔ دو دفعہ تمہارے گھر گیا۔ تم ملے نہیں۔ اس لئے پریشانی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ جی میں آیا کہ کیوں نہ خودکشی کرلوں"۔

مجھے اُس کی اِن باتوں پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ اُس کا دل ہاتھوں میں لیا اور کہا "میری غلطی ہے کہ میں تمہیں اطلاع دے کر باہر نہیں گیا۔ جلدی میں جانا ہوا، ورنہ تمہیں اطلاع ضرور دیتا۔ بہرحال اب میں موجود ہوں۔ روزانہ تمہارے پاس آؤں گا۔ کہو تو تمہارے پاس ہوسٹل ہی میں رہنا شروع کردوں"۔

میری یہ باتیں سُن کر آغا حسن کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا۔ برہمی کم ہوئی، اور پھر ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں شکوہ و شکایت کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس لئے اُس نے اصرار کیا کہ اُس کے ساتھ کھانا کھا کر واپس گھر جاؤں۔

میں نے کہا "اچھا، "این ہم اندر عاشقی"۔۔۔

ہم نے ایک ساتھ ہوسٹل کا کھانا کھایا، اور اس کے بعد بھی کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔

دورانِ گفتگو میں نے کہا "آج الفنسٹن سینما میں نیو تھیٹرز کی فلم دیوداس، لگی ہوئی ہے۔ سارا شہر اس کو دیکھ کر دیوانہ ہوگیا ہے۔ میں کل تمہیں یہ فلم دکھاؤں گا۔ سہگل کی ایکٹنگ اس میں خوب ہے اور گانے تو ایسے ہیں کہ اُن کا جواب نہیں۔ کل تم لیکچروں کے بعد میرے ہاں آجانا۔ پھر ہم دونوں میٹنی شو میں یہ فلم دیکھنے چلیں گے"۔

آغا حسن نے اس تجویز کو پسند کیا۔ دوسرے دن میرے ہاں آئے، اور ہم دونوں غالباً فلم دیوداس، دیکھنے کے لئے الفنسٹن سینما قیصر باغ چلے گئے۔ ساڑھے آٹھ آٹھ آنے کے دو ٹکٹ لئے اور سینما میں جا کر بیٹھ گئے۔ فلم شروع ہوئی۔ ابھی چند منٹ ہی گذرے تھے کہ دیکھا آغا حسن سسکیوں سے رو رہا ہے۔ میں اس کے رونے کی آواز سُن کر پریشان ہوگیا۔

پوچھا "کیا بات ہے"؟

اس نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ بس یوں ہی مجھے رونا آ رہا ہے"۔

میں نے کہا "ابھی تو فلم کا وہ حصّہ سامنے ہی نہیں آیا جو بے حد ٹریجک ہے۔ تم نے تو ابھی سے رونا شروع کر دیا۔

آغا حسن نے کہا "میں فلم کی ٹریجڈی کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں۔ بس یوں ہی رونے کو میرا جی چاہ رہا ہے۔ رونے کا سبب مجھے بھی معلوم نہیں۔ کچھ اختلاجی سی کیفیت ہے"۔

میں نے کہا "اچھا چلو، باہر چلتے ہیں۔ ٹھنڈی بوتل پئیں گے۔ سنترے کھائیں گے۔ اس سے تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی"۔

چنانچہ میں اُس کو باہر لے گیا۔ گولی والی لیمن کی بوتل جو اس زمانے میں 'لیمنیڈ' کہلاتی تھی، اس کو پلائی۔ سنترہ کھلایا۔ اس سے اس کی طبیعت کچھ ٹھیک ہو گئی۔ پھر ہم سینما ہال میں گئے اور بقیہ فلم دیکھی۔ فلم کے دوران کئی بار آغا حسن پر رقّت طاری ہوئی، اور وہ کئی بار رو دیا۔ بہرحال فلم ختم ہوئی تو ہم گھر واپس آئے۔ کھانا کھایا، اور آغا حسن کو ہوسٹل پہنچا کر گھر واپس آیا۔

ایسی کیفیت آغا حسن پر اکثر طاری ہوتی تھیں۔ دراصل وہ بچپن ہی سے بے حد جذباتی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے خاندان میں اکیلا لڑکا تھا۔ بہنیں تو اُس کی کئی تھیں لیکن بھائی کوئی اور نہیں تھا۔ ناز و نعم اور لاڈ پیار میں اُس کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کے والد صاحب اپنی منصبی مصروفیات کے سلسلے میں لکھنؤ سے باہر محمود آباد میں رہتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا تھا۔ اس احساسِ تنہائی نے اُس کی زندگی میں ایک خلا کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اسی لئے وہ ایسے لوگوں کے پیچھے دوڑتا تھا جن سے اس کو ذہنی مناسبت تھی۔ وہ سہارے ڈھونڈتا تھا۔ یہ سہارے اس کو نصیب نہ ہوں تو وہ اُداس ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کے اندر ایک اختلاجی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، اور وہ رونے اور آنسو بہانے تک

کے لئے مجبور ہو جاتا تھا۔

یونیورسٹی میں آنے کے بعد آغا حسن کی شخصیت میں جذب وکشش کی وہ کیفیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی جو بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں بھی اپنے شباب پر تھی۔ اب وہ جوانی سے ہم کنار تھا لیکن اُس کی جوانی دیوانی نہیں تھی۔ وہ نہایت شرمیلا سا آدمی تھا۔ کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنا اُس کے لئے ناممکن تھا۔ لیکن اُس کے اس انداز میں بھی ایک دلبری اور دلرُبائی تھی۔ اس کے سانولے رنگ اور کتابی چہرے میں ایک ایسی کیفیت تھی جو میں نے اپنے کسی دوسرے ساتھی میں نہیں دیکھی اور اُس کے رُخساروں میں وہ جو ایک ڈمپل نظر آتا تھا، اُس میں تو ایک قیامت خیز کیفیت تھی۔ اس کے اِس حُسن بلاخیز کو دیکھ کر میں اکثر میر صاحب کا یہ شعر پڑھ کر اس کو چھیڑتا تھا ؎

رخسار اُس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم
جی چاہتا ہے آنکھوں کو اُن میں گڑو دیئے

اور وہ یہ شعر سُن کر ایک انداز محجوبی سے پانی پانی ہو جاتا تھا۔ کچھ اس طرح شرماتا، لجاتا، اور بل کھاتا تھا کہ کسی شاہد رعنا کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بڑے بڑے بالوں میں ہر وقت انگلیاں پھیرتا رہتا تھا، اور اس کے لہجے میں ایسی شیرینی ہوتی تھی جس پر شہد وشکر کا گمان ہوتا تھا۔ اب وہ شیروانی کی بجائے سوٹ پہننے لگا تھا، اور اس لباس نے اُس کے حُسن نمکیں، میں کچھ ایسی جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دی تھی کہ جو بھی اُس کو دیکھتا تھا بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ اس کی جامہ زیبی بھی اب اپنے شباب پر تھی۔

آغا حسن کے اس انداز دلبری اور طرز دلربائی نے یونیورسٹی کی بعض لڑکیوں کے دلوں میں ایسے ایسے طوفان اٹھائے تھے جن کو دیکھ کر کوئی زاہد خشک بھی پھسل جاتا۔ لیکن آغا حسن کی تہذیب، شائستگی، شرافت، نیکی اور بلند اخلاقی ہمیشہ عناں گیر رہی۔ اُس کے قدم کبھی ڈگمگائے نہیں اور وہ کبھی پھسلا نہیں۔ وہ ہمیشہ اس عالم میں بھی پاک دامن ہی رہا۔ یہ اُس کے کردار کی بلندی تھی، اور کردار کی یہ بلندی ساری

زندگی اُس کے دم کے ساتھ رہی۔

آغا حسن نے دو سال میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ام۔اے انگریزی اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے، اور چند مہینے بعد وکالت شروع کر دی۔ محمود آباد ہاؤس قیصر باغ میں انہیں رہنے اور وکالت کا دفتر بنانے کے لئے جگہ مل گئی۔ چنانچہ اُنہوں نے محمود آباد ہاؤس کے باہر سید آغا حسن عابدی، ام۔اے، ایل ایل بی ایڈووکیٹ کا بورڈ لگا دیا۔ کچہری بھی جانے لگے۔ لیکن ابھی چند مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ اس پیشے سے اُن کا جی اُچاٹ ہو گیا، اور وہ وکالت کی زندگی سے بیزار نظر آنے لگے۔

وکالت کی ابتدائی منزلیں بہت سخت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کام بہت خشک قسم کا اور غیر دلچسپ ہوتا ہے دوسرے نئے وکیلوں کو مُوکّل گھاس نہیں ڈالتے۔ آغا حسن طبعاً" کچہریوں درباروں کے آدمی نہیں تھے۔ مزاج میں رومانیت تھی۔ انگریزی ادب پڑھ کر کچھ زیادہ ہی رومانی مزاج ہو گئے تھے۔ خوابوں کی دُنیا میں اُن کا بسیرا تھا۔ ہر وقت خواب دیکھتے تھے، اور حصولِ حُسن و طمانیت کے لئے وادیٔ خیال کو مستانہ طے کر کے آسمانوں پر پرواز کرتے تھے۔ ایسا آدمی بھلا وکالت کے جنجال میں کیسے پھنس سکتا ہے۔ چنانچہ بہت جلد آغا حسن نے وکالت کے پیشے کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک دن میں حال احوال معلوم کرنے کے لئے اُن کی جائے قیام پر محمود آباد ہاؤس گیا، تو دیکھا کہ بہت اُداس اور زندگی سے بیزار بیٹھے ہیں۔

میں نے اُن کی یہ حالت زار و زبوں دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے"؟
کہنے لگے "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا"۔
میں نے کہا "میں آ گیا۔ لیکن آج آپ سید انشا کے اس شعر کی تصویر بنے کیوں بیٹھے ہیں؟

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تُجھے اٹکھیلیاں سُوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"۔

کہنے لگے "یار! واقعی میں آج کل اس شعر کی تصویر بنا ہوا ہوں۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ ہر وقت طبیعت پر اُداسی اور بیزاری چھائی رہتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں"؟

میں نے کہا "ایسی بھی کیا بات ہے! اب تو زندگی کے بہت سے مراحل طے ہو چکے ہیں۔ تعلیم سے تم فارغ ہو چکے۔ وکالت تم نے شروع کر دی ہے۔ ایک آدھ سال میں نامور وکیل بن جاؤ گے۔ آؤ، حضرت گنج چلتے ہیں۔ وہاں کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھیں گے۔ تمہاری اُداسی دُور ہو جائے گی"۔

آغا حسن کو میری یہ تجویز پسند آئی، اور وہ میرے ساتھ حضرت گنج جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

ہم لوگ محمود آباد ہاؤس سے باہر نکلے اور قیصر باغ کی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے بارہ دری تک پہنچے تھے کہ آغا حسن رُک گئے، اور کہنے لگے "میں وکالت نہیں کر سکتا۔ وکالت بڑا ہی غیر دلچسپ اور صبر آزما پیشہ ہے۔ میرے مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا"۔

میں نے کہا "پھر کیا کرو گے؟ وکالت کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ تم لکھنؤ میں رہو گے۔ کوئی ملازمت کی تو باہر جانا پڑے گا۔ تم اپنے گھر سے دُور ہو جاؤ گے۔ خوب سوچ سمجھ لو"۔

آغا حسن نے کہا "وکالت میں میرا دل نہیں لگتا۔ مجھے کچہری کے ماحول سے اُلجھن ہوتی ہے۔ قانون کی باریکیاں اور موشگافیاں میرے مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں"۔

میں نے کہا "اگر تم یہ فیصلہ کر ہی چکے ہو تو پھر کوئی ملازمت تلاش کرنی چاہیئے۔ موجودہ حالات میں ملازمت کا ملنا آسان نہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کو بڑی ہی سنگین صورت حال ہے"۔

یہ باتیں کرتے ہوئے، ہم حضرت گنج کی طرف چل دیئے۔ چند منٹ میں وہاں

پہنچے۔ایک ریستوران میں بیٹھے۔باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

آغا حسن کچھ سوچ کر بولے "اگر کوئی معقول ملازمت نہ ملی تو میں محمود آباد اسٹیٹ میں کوئی ملازمت کرلوں گا۔گذر بسر ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اتنی ڈگریاں لے کر اور اتنا پڑھ لکھ کر محمود آباد اسٹیٹ کی ملازمت تمہارے شایانِ شان نہیں ہوگی۔ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے۔حبیب بینک نیا نیا کھلا ہے۔یہ مسلمانوں کا بینک ہے۔اگر راجہ صاحب محمود آباد، حبیب سیٹھ کو سفارشی خط لکھ دیں گے تو اس بینک میں تمہیں آفیسر کی جگہ مل جائے گی۔لیکن یہ سوچ لو کہ اس کے لئے بمبئی جانا ہو گا۔لکھنؤ سے باہر رہنا ہو گا۔"

آغا حسن نے کہا "یار! کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں بینک کی ملازمت کروں گا! تم میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔یہ ملازمت میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔"

میں نے کہا "میاں صاحب زادے! حالات بہت سنگین ہیں۔مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے دروازے بند ہیں۔مجھے تو صرف یہی دروازہ کھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔راجہ صاحب سے حبیب سیٹھ کے نام خط لکھوالو، اور چپ چاپ بمبئی چلے جاؤ۔اس ملازمت میں آئندہ ترقی کے امکانات بہت ہیں۔"

آغا حسن کو میری یہ تجویز پسند نہیں آئی۔لیکن وہ اس کے بارے میں سوچتے رہے۔لیکن بالآخر انہوں نے میری تجویز پر عمل کیا راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حبیب سیٹھ کو خط لکھنے کی درخواست کی۔راجہ صاحب نہایت شریف انسان تھے۔انہوں نے آغا حسن کے لئے خط لکھ دیا، اور کہا کہ "یہ خط لے کر آپ بمبئی چلے جائیے۔انشاءاللہ کام ہو جائے گا۔"

دوسرے دن یہ خط لے کر آغا حسن میرے پاس گھر پر آئے اور کہنے لگے "یار! راجہ صاحب نے ازراہ نوازش خط تو لکھ دیا ہے۔لیکن میں الجھن میں

ہوں۔ کیا کروں؟ مجھے رائے دو!"۔

میں نے کہا "یہ خط لے کر آپ فوراً بمبئی چلے جائیے۔ حبیب سیٹھ سے ملئے۔ یہ خط انہیں پہنچائیے، اور حبیب بینک میں آفیسر کے عہدے پر فائز ہوجائیے"۔

آغا حسن میری بات مانتے تھے۔ اس لئے میرے کہنے پر بمبئی جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ اور ایک ہفتے بعد بادلِ نخواستہ بمبئی روانہ ہوگئے۔

تین چار دن کے بعد بمبئی سے اُن کا خط آیا۔ لکھا تھا۔ راجہ صاحب کے خط نے بڑا کام کیا۔ مجھے ملازمت مل گئی۔ یہاں ماحول اچھا ہے۔ بمبئی شہر بہت خوبصورت ہے۔ میرا دل یہاں لگ گیا ہے۔ ابھی ٹریننگ ہورہی ہے۔ تین چار مہینے میں ٹریننگ مکمل ہوگی، اور حبیب بینک کی مختلف برانچوں کی تنظیم کا کام میرے سپرد کیا جائے گا۔ اسی سلسلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرنا ہوگا"۔

مجھے یہ خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔

یہ ۱۹۴۴ء کے آخری دن تھے۔ اسی زمانے میں مجھے اینگلو عربک کالج دہلی میں اُردو کی لیکچرشپ مل گئی، اور میں لکھنؤ کو چھوڑ کر دِلّی چلا گیا۔ قیامِ پاکستان تک دِلّی میں میرا قیام رہا۔ اس عرصے میں آغا حسن کئی بار دورے پر دلّی آئے، اور میرے ساتھ ٹھہرے۔ اب وہ ایک بدلے ہوئے انسان تھے۔ اُن کی جذباتیت اب بڑی حد تک ختم ہوگئی تھی، اور اُن کی شخصیت میں خود اعتمادی کا رنگ رچا ہوا نظر آتا تھا۔ صبح کو وہ میرے ساتھ ناشتہ کرکے باہر نکلتے تھے اور مغرب کے بعد میری جائے قیام پر واپس آتے تھے۔ دن بھر بینک کی تنظیم کا کام کرتے تھے، اور شام کو واپسی پر اپنے مصروفیات کی پوری داستان مجھے سُناتے تھے۔ میں اس بدلے ہوئے انسان کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا، اور پھولا نہیں سماتا تھا۔ اس لئے کہ آغا حسن میں یہ تبدیلی میرے ذہن سے نکلی ہوئی ایک تجویز کی وجہ سے

پیدا ہوئی تھی۔ میں نے جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر لگا تھا۔

سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں آغا حسن اپنی منصبی مصروفیات کے سلسلے میں کئی بار بمبئی سے دلی آئے اور میرے ساتھ ٹھہرے۔ صبح کو باہر نکلنا، دن بھر کام میں مصروف رہنا، اور رات گئے میری جائے قیام پر واپس آنا، اُن کا معمول تھا۔ اُن کی اس بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر مجھے بڑی مسرّت ہوتی تھی۔

اور پھر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ پاکستان کے ہر شہر میں حبیب بینک کی کئی کئی شاخیں کھُل گئیں اور آغا حسن لاہور کی مرکزی برانچ میں مینجر بنا دیئے گئے۔ اس حیثیت سے اُنھوں نے حبیب بینک کے لئے شب و روز ان تھک محنت کی، اور بینک کو ترقی سے ہمکنار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

میں جب دِلّی سے لُٹ پٹ کر لاہور پہنچا، اس وقت آغا حسن حبیب بینک کی ایک اہم برانچ کے مینجر تھے، اور ایک بینکر کی حیثیت سے شہر میں اُن کی بڑی شُہرت تھی۔

ایک دن میں مال روڈ سے اورینٹل کالج کی طرف جا رہا تھا۔ بینک اسکوائر کے قریب پہنچا تو خیال آیا کہ آغا حسن سے حبیب بینک میں مِلتا چلوں۔ بینک میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آغا حسن بینک مینجر کی کُرسی پر سامنے بیٹھے ہیں۔ میں سیدھا اُن کے پاس گیا۔ بڑی محبت سے مِلے۔ معانقہ کیا، اور اپنے پاس بٹھایا، اور پوچھا "تم کب آئے؟"

میں نے کہا "میں کوئی تین ہفتے سے لاہور میں ہوں۔ اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں یونیورسٹی ریڈر کی حیثیت سے میرا تقرر ہو گیا ہے۔ گھر والے بھی پرسوں لکھنؤ سے واہگہ کے راستے آگئے ہیں۔ مکان میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے اِن لوگوں کو میں نے میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دو کمروں میں بارہ آدمی فرش پر سو رہے ہیں۔ کئی کوٹھیاں میرے نام الاٹ ہوئی ہیں لیکن اُن میں مہاجر بیٹھے ہیں۔ پولیس سے اِن مہاجروں کو نکلواؤں تو میں اِن میں

داخل ہو سکتا ہوں۔ اور یہ کام میں کر نہیں سکتا۔"

آغا حسن نے میری یہ بپتا سُن کر مجھے تسلّی دی اور کہا "فکر نہ کرو مکان کا انتظام ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے بینک کے ایک افسر مظہر خاں صاحب کو بُلایا، اور اُنہیں میرے پاس بٹھا کر اُن سے پوچھا "خاں صاحب! اگر آپ کو لائل پور کی کسی برانچ میں پوسٹ کر دیا جائے تو آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی"؟۔

خاں صاحب بولے "آپ نے تو یہ میرے دل کی بات کہی۔ میرے گھر کے سب لوگ لائل پور میں ہیں۔ میں یہاں تنہا سمن آباد کے نئے کوارٹر میں رہتا ہوں۔ بچّوں کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے خاصی تکلیف ہے"۔

آغا حسن نے کہا "تو پھر آپ لائل پور چلے جائیے۔ اپنے بچّوں کے ساتھ اطمینان سے وہاں رہیئے۔ حبیب بینک لائل پور کی مرکزی برانچ میں آپ کی پوسٹنگ کروا دیتا ہوں۔ آپ کو وہاں بینک کی طرف سے مکان بھی مِلے گا، اور اس کے علاوہ دوسری سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی ___ لیکن آپ اپنا سمن آباد کا نیا کوارٹر مجھے دے دیجیئے۔ اس کا آپ کو معقول کرایہ مِلے گا۔"

مظہر خاں صاحب اس تجویز سے بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے کہا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ یہ تجویز تو میرے حق میں نہایت مناسب ہے۔ مجھے اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے"۔ جب آپ فرمائیں گے میں لائل پور چلا جاؤں گا۔"

آغا حسن نے کہا "آپ اگلے ہفتے لائل پور جا کر چارج لے لیجیئے۔ میں مناسب کاروائی کر دوں گا۔"

مظہر خاں صاحب شُکریہ ادا کر کے رُخصت ہوئے تو آغا حسن نے مجھ سے کہا "لو بھئی! مکان کا انتظام تو ہو گیا۔ اب تم اس میں اطمینان سے رہو۔ یہ مکان لاہور کے ڈپٹی کمشنر اور لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے چیئرمین ظفر الاحسن صاحب نے چوبُرجی کے قریب سمن آباد میں تعمیر کروائے ہیں، اور کم قیمت پر ضرورت مند

لوگوں کو دیئے ہیں ۔ملتان روڈ پر یہ نئی آبادی ہے ۔ کھلا ہوا سرسبز و شاداب علاقہ ہے ۔اور یہاں سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے ۔ ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہوگا۔ وہاں پانی، بجلی، فلش سب کچھ ہے۔ تمہیں وہاں آرام ملے گا ۔اطمینان نصیب ہوگا"

میں آغا حسن کی یہ باتیں سنتا رہا، اور یہ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ چلو ایک مسئلہ تو حل ہوا۔ مکان کا ملنا ایک بہت بڑی نعمت ہے ۔سر چھپانے کی جگہ نہ ہو تو انسان اُکھڑا اُکھڑا سا رہتا ہے اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ آغا حسن نے چند منٹ میں اس مسئلے کو حل کیا ، اور مجھ پر ایک ایسا احسان کیا جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں نے خاموشی کی زبان میں اُس کا شکریہ ادا کیا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس لئے کہ وہ میرا بچپن کا ساتھی تھا اور میری اُس سے بے تکلفی تھی ۔اس لئے زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف یہ کہہ کر اُس کے پاس سے رُخصت ہوا کہ "یار! تم نے بڑا کام کیا۔ ہجرت کر کے آنے والے لوگ تمہیں دعائیں دیں گے"۔

تین چار روز کے بعد ہم لوگ سمن آباد کے اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ اچھا خاصا مکان تھا۔ اس میں چار کمرے تھے۔ پانی ، بجلی اور فلش کی سہولتیں بھی تھیں ۔مکان کے اندر صحن اور دوسری طرف سامنے لان بھی تھا۔ آس پاس رہنے والے بھی معقول لوگ تھے ۔

یہ مکان ملا تو سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بے سروسامانی کے احساس سے نجات ملی ۔ ہوٹل میں زندگی عذاب تھی ۔کیونکہ یہ نام کا ہوٹل تھا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف چھوٹے چھوٹے خالی کمرے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل کوئی ہندو اس کو چلاتا تھا۔ وہ چلا گیا تو سامان لوگوں نے لوٹ لیا۔ صرف عمارت رہ گئی جس کو کسی مہاجر نے اپنے نام الاٹ کروا لیا۔ سامان میں نے اورینٹل کالج ہوسٹل کے دو کمروں میں رکھ دیا تھا۔ وہ سارا سامان ہم لوگ اس مکان میں لے آئے، اور اس میں اطمینان سے رہنے لگے۔

یہ سب کچھ آغا حسن کی وجہ سے ہوا۔ آغا حسن میں بچپن ہی سے میں نے یہ

خصوصیت دیکھی کہ وہ دوستوں کا دوست تھا، اور ہر مشکل وقت میں اُن کے کام آتا تھا۔ ذہانت اور معاملہ فہمی اُس میں ایسی تھی کہ وہ چند منٹ میں مسائل کو حل کر دیتا تھا۔ دوستوں کی تو خیر بات ہی اور ہے، وہ تو ہر شخص کی مدد کرتا تھا۔ نہ جانے کتنے نوجوانوں کو اُس نے ملازمت دی۔ نہ جانے کتنے طالب علموں کو اُس نے وظیفے دیئے تاکہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ نہ جانے کتنے مریضوں کا اُس نے علاج کرایا، نہ جانے کتنی بیواؤں اور یتیموں کی اُس نے اس طرح مدد کی کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ خاندانی شرافت، انسانیت اور انسان دوستی کی خصوصیات اُس میں ایسی تھیں جو میں نے کم لوگوں میں دیکھی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی شخصیت کی اِن خصوصیات میں اضافہ ہوتا گیا، اور اُس نے اپنی زندگی اِن فلاحی کاموں کے لئے وقف کر دی۔

ایک زمانے تک آغا حسن حبیب بینک میں کام کرتے رہے اور اعلٰے سے اعلٰے عہدوں تک پہنچے۔ اُن کا زیادہ وقت اس زمانے میں لاہور اور کراچی میں گذرا۔ اس زمانے میں وہ مصروف بہت تھے لیکن گھنٹوں میرے پاس آکر بیٹھتے تھے، اور ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے اپنے کچھ ذاتی کام بھی میرے سپرد کر دیتے تھے جن کو میں کر دیتا تھا، اور اُن کے یہ کام کر کے مجھے ہمیشہ ایک عجب طرح کی مسرّت ہوتی تھی، اور اُنہیں سکون ملتا تھا۔

تقریباً بیس سال اُنہوں نے حبیب بینک میں گذارے۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ اُنہوں نے حبیب بینک کو خیرباد کہہ دیا، اور پھر یونائیٹڈ بینک کے نام سے ایک نئے بینک کی داغ بیل ڈالی۔ اس نئے بینک کو پروان چڑھانے اور ترقی سے ہم کنار کرنے میں اُنہوں نے شب و روز کام کیا اور اُن کی ان تھک محنت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ چند سال کے عرصے میں حبیب بینک کے شانہ بشانہ ترقی کے راستے پر آگے کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ پاکستان کے علاوہ انہوں نے اس

بینک کی شاخیں بیرونی ملکوں میں بھی قائم کیں۔ خاص طور پر عرب امارات میں یونائیٹڈ بینک نے اپنے قدم جما لئے۔ اِس زمانے میں انہوں نے شیخ زید بن سلطان النہیان سے رابطہ قائم کیا، اور یہ بینک آغا حسن سے اُن کی دوستی کی بُنیاد بنا جو آج تک نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ آغا حسن کے اس بینک نے شیخ زید کی مدد کی، اور جب اُن کے علاقے میں تیل نکل آیا، اور دولت کی ریل پیل ہوئی تو شیخ زید نے اس بینک کو اپنی اس دولت سے مالامال کر دیا۔ وہ آغا حسن کی بصیرت سے اتنے متاثر ہوئے کہ آج تک کوئی کام اُن کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے۔ اس میں آغا حسن کی لطیف شخصیت، اُن کے خلوص و محبت اور بینکنگ میں اُن کی بصیرت کو بڑا دخل تھا۔ عرب امارات، خصوصاً ابوظہبی نے اس زمانے میں ترقی کی ایسی منزلیں طے کیں کہ اُس کا شمار دُنیا کے اہم ممالک میں ہونے لگا۔ اس میں آغا حسن کا بڑا ہاتھ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شیخ زید آغا حسن کی دلنواز اور بصیرت افروز شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے آغا حسن کو اپنا مالیاتی مشیر بنا لیا اور کبھی کوئی کام اُن کے مشورے کے بغیر نہیں کیا۔ آج بھی وہ اس پر کاربند ہیں، اور یہ اُن کی وضع داری اور دُور اندیشی ہے۔

یونائیٹڈ بینک ایک پاکستانی بینک تھا لیکن اس نے صرف چند سال میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ آغا حسن اس کے صدر تھے، اور اُن کی تمام صلاحیتیں اس کے لئے وقف تھیں۔ انہوں نے اپنے اس بینک کے لئے شب و روز کام کیا۔ اچھے لوگوں کو اس میں جمع کیا جنہوں نے اُن کے ساتھ محنت کی، اور دیکھتے دیکھتے یہ بینک پاکستان کے بڑے بینکوں میں شمار کیا جانے لگا۔ آغا حسن نے اس بینک کے ذریعے سے پاکستان کی خدمت کی اور کئی ایسے منصوبوں پر کام کیا جن کی وجہ سے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ لیکن جب پاکستان میں بینک قومی تحویل میں لئے گئے تو آغا حسن نے اس کو خیرباد کہا، اور وہ مُلک سے باہر چلے گئے۔

مُلک سے باہر جا کر اُنہوں نے ایک اور بین الاقوامی بینک کی تاسیس کا منصوبہ بنایا، اور بہت تھوڑے عرصے میں اُنہوں نے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل (بی۔سی۔سی۔آئی) کے نام سے ایک اچھا خاصا بڑا بینک قائم کر دیا۔ جرمنی کے شہر لکسمبرگ میں اس کو رجسٹر کروایا، اور لندن میں بھی اس کی ایک شاخ قائم کی۔ اب وہ لندن میں مستقل طور پر رہنے لگے، اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور اَن تھک محنت سے اس بینک کو اتنی ترقی دی کہ بہت تھوڑے عرصے میں اس کا شمار دُنیا کے بڑے بینکوں میں ہونے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے سرمائے میں اتنا اضافہ ہوگیا، اور اس کی آمدنی اتنی بڑھ گئی کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

آغا حسن نے اس بینک کی شاخیں دُنیا کے مختلف ممالک میں قائم کیں اور اِن ملکوں کے بڑے بڑے منصوبوں میں رقم لگائی، اور اس کی بدولت اس کی آمدنی میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بینک نے ایک ایمپائر یعنی سلطنت کی صورت اختیار کرلی۔

آغا حسن نے اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں سے اس بینک کو ترقی کی ایسی شاہراہوں پر ڈال دیا کہ دُنیا کے بڑے بڑے بینک بھی اس پر رشک کرنے لگے۔ میکنامارا تک نے اس کا اعتراف کیا، اور آغا حسن کو دُنیا کا ایک اہم بینکر قرار دیا، اور کئی ایسے بیانات دیئے جن میں آغا حسن کی دل کھول کر تعریف کی، اور اُن کی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا۔

اس زمانے میں آغا حسن چاہتے تو امریکہ، انگلستان، عرب امارات، سعودی عرب، جرمنی، کسی مُلک کے بھی شہری بن کر وہاں اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ پاکستانی ہی رہے اور اُنہوں نے پاکستان ہی کو اپنا وطن سمجھا۔ پاکستان کے مختلف فلاحی منصوبوں میں شرکت کی اور اُس کی معیشت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں پاکستان کی مختلف

حکومتوں کا ہاتھ بٹایا۔ پاکستان اُن کی اِن خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

آغا حسن اس زمانے میں رہتے تو لندن میں تھے لیکن ہر مہینے چند روز کے لئے پاکستان ضرور آتے تھے۔ کراچی اور لاہور میں بیٹھ کر اپنے بینک کی کارکردگی کا جائزہ لیتے تھے، اور جو منصوبے اُنہوں نے بنائے تھے، اور اس سلسلے میں جو فاؤنڈیشن وغیرہ انہوں نے قائم کئے تھے، اُن کی ترقی کے لئے اپنے رفقاء کو ضروری ہدایات دیتے تھے۔ اس زمانے میں اُنہوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر پاکستان اور پاکستانیوں کی جو مدد کی، وہ ایک ایسی داستان ہے جو پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

اب آغا حسن اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ اُن کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس لئے مجھ سے بھی اُن کی ملاقات بس کبھی کبھی ہی ہوتی تھی۔ جب بھی مجھ سے ملنے آتے تھے تو رات گئے میرے ہاں پہنچتے تھے۔ اپنی مصروفیت کا ذکر کرتے تھے اور زیادہ نہ ملنے کی معذرت کرتے تھے۔ میں بھی اُن سے ملنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ اتنے مصروف ہیں کہ اُنہیں خود اپنا ہوش نہیں ہے۔

اُن کا ذاتی جہاز ایئرپورٹ پر کھڑا رہتا، اور جس وقت بھی وہ اپنے کاموں سے فارغ ہوتے اس جہاز میں بیٹھ کر لندن روانہ ہو جاتے۔ لیکن پرواز سے قبل مجھے فون ضرور کرتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ "آج تم سے ملنے کا پختہ ارادہ تھا۔ لیکن بینک کے کاموں نے مہلت نہیں دی۔ اس لئے تمہارے ہاں نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ تم سے ملنے کو جی بہت چاہتا تھا۔"

ایک دن اُنہوں نے ساڑھے گیارہ بجے میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا، اور کہا کہ "آج تم سے ضرور مل کر جاؤں گا۔" لیکن وہ ساڑھے گیارہ بجے نہیں آئے۔ میں انتظار کرتا رہا۔ بارہ بجے اُن کا فون آیا۔ آغا حسن بول رہے تھے۔ کہنے لگے "یار! تم ناراض ہو گئے ہو گے۔ میں وعدہ کر کے ساڑھے گیارہ

بجے تمہارے ہاں نہ پہنچ سکا۔ خیال تھا اُس وقت تک فرصت ہو جائے گی، اور میں تمہارے پاس ایک گھنٹہ ذرا اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کروں گا۔ لیکن ابھی تقریباً بیس پچیس آدمی یہاں بیٹھے ہیں۔ اُن سے ملنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ وہ ضرورت مند ہیں۔ ایک بجے میری فلائٹ ہے۔ اس لئے آج بھی پہنچنا مشکل ہے۔ آئندہ لاہور آیا تو ضرور ملوں گا۔"

میں نے کہا "تمہارے اندازِ محبوبی اور طرزِ دلرُبائی میں آج تک کمی نہیں آئی۔ ابھی تک انتظار کرواتے ہو اور ہجر و فراق میں تڑپاتے ہو۔ خیر، چونکہ تم ضرورت مند لوگوں میں گھِرے ہوئے ہو، اور اُن کی مدد کرنا چاہتے ہو، اس لئے میں نے معاف کیا۔ آئندہ جب بھی لاہور آؤ میرے ہاں ضرور آنا۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے پُرانی یادیں تازہ ہوں گی۔"

آغا حسن نے کہا "تمہاری باتوں میں مزہ آیا۔ انشاء اللہ جلد مُلاقات ہوگی۔"

اس کے بعد اگلے مہینے آغا حسن پھر لاہور آئے۔ ایک صاحب کے ہاتھ اُنھوں نے یہ پیغام بھیجا کہ وہ رات کو دس بجے میرے ہاں نیو کیمپس پہنچیں گے، اور پھر دیر تک باتیں ہوں گی۔

چنانچہ وہ رات کو دس بجے سے کچھ پہلے ہی میرے ہاں پہنچ گئے۔ خاصے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔

کہنے لگے "ایک زمانے سے میں وعدہ خلافی کر رہا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت گھیر لیتی ہے، اور میں تم سے باوجود کوشش کے نہیں مِل پاتا۔ آج اس کی تلافی ہوگی۔ دیر تک بیٹھوں گا، اور تم سے باتیں کروں گا۔"

میں نے کہا "زہے نصیب! تمہیں فرصت تو مِلی۔ تم نے میرے پاس آنے کے لئے وقت تو نکالا۔"

کہنے لگے "ایک سرکاری دعوت سے اُٹھ کر آیا ہوں۔ اگر وہاں سے بھاگتا نہیں تو گیارہ بارہ ضرور بجتے۔"

میں نے پوچھا "چائے یا کافی پیو گے؟"

بولے "تم تو جانتے ہو میں بچپن سے چائے اور کافی نہیں پیتا۔ ابھی تک اس پر قائم ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس تم سے باتیں کروں گا۔ اور یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔"

میں نے کہا "کھانا کھا لو۔"

کہنے لگے "کھانا تو میں کھا کے آیا ہوں۔ ایک جگہ سرکاری قسم کا ڈنر تھا۔ وہاں کھا لیا، اور کھانا کھا کے جلدی سے تمہارے پاس آ گیا۔ اگر وہاں ٹھہرتا تو بہت دیر ہو جاتی۔ شکر ہے کہ تمہارے ہاں پہنچ گیا۔ تم کوئی تکلف نہ کرو۔ کسی روز اطمینان سے آ کر تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔"

میں نے کہا "میاں! اتنی مصروفیت اچھی نہیں۔ دوڑ دھوپ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری مصروفیات کا علم ہوتا رہتا ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھو!"
آغا حسن کہنے لگے "بینک کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ شب و روز مصروف رہنا پڑتا ہے۔ تم تو پروفیسر ہو۔ یونیورسٹی میں لڑکوں کو پڑھاتے ہو۔ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہو۔ ادیب ہو۔ بینکنگ کے معاملات و مسائل کو نہیں سمجھ سکتے، اور نہ سمجھو تو بہتر ہے۔ ہم نے تو اب کشتی دریا میں ڈال دی ہے۔ تمہارے مشورے سے میں نے یہ پیشہ اختیار کیا۔ اب مجھے اپنا ہوش نہیں ہے۔ اب تم بتاؤ آج کل کیا کیا ادبی کام کر رہے ہو؟"

میں نے کہا کام تو خاصا ہو گیا ہے، اور ہو رہا ہے۔ خاصی تعداد میں میری کتابیں چھپ گئی ہیں۔ لکھنے پڑھنے میں زیادہ وقت گذارتا ہوں۔ کئی سال سے اُردو کی پروفیسری، شعبۂ اُردو کی صدارت، شعبۂ تاریخ ادبیات کی ڈائرکٹری کے ساتھ اورینٹل کالج کی پرنسپلی کا بوجھ بھی میرے شانوں پر آ پڑا ہے۔ انتظامی کاموں میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بھی کرنا پڑتا ہے۔ پروفیسری میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جب انتظامی کام بھی گلے کا ہار ہو جاتے ہیں۔ میٹنگوں میں بہت

وقت ضائع ہوتا ہے۔ بہر حال آج کل یہی لیل و نہار ہیں۔ صبح کو کالج جاتا ہوں۔ دو بجے تک وہاں رہتا ہوں۔ اس کے بعد گھر آ کر رات گئے تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں"۔

آغا حسن نے کہا "مصروفیت ایک نعمت بھی ہے۔ اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ علمی کام بہ ذات خود ایک انعام ہوتا ہے۔ دوسرے انتظامی کاموں کو لوگ بھلا دیتے ہیں۔ لیکن علمی ادبی کام لوگوں کے دلوں اور اُن کے ذہنوں میں زندہ رہتا ہے۔ بینک وغیرہ کا کام (Thankless job) ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو، ـــ تم اس اعتبار سے خوش قسمت ہو"۔

غرض دیر تک آغا حسن سے اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے رات کو وہ پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔

لیکن اس کے بعد دو تین سال تک میری اُن سے مُلاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ اب وہ مستقل طور پر لندن میں رہنے لگے تھے، اور اُن کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اپنی خداداد انتظامی صلاحیت اور ان تھک محنت نے اُن کے بینک بی۔ سی۔ سی۔ آئی کو ایک سلطنت بنا دیا تھا۔ تیسری دُنیا کے ممالک میں اُنہوں نے اپنے اس بینک کی بے شمار شاخیں کھول دی تھیں، اور بڑے بڑے منصوبوں پر خاصا سرمایہ لگایا تھا اور اس سے بینک کی آمدنی بھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ کراچی تو وہ ہر دوسرے مہینے آتے تھے لیکن لاہور کبھی کبھی ہی آنا ہوتا تھا۔ آندھی اور طوفان کی طرح آتے تھے اور لندن واپس چلے جاتے تھے۔

البتہ کبھی کبھی لندن اور کراچی سے مجھے فون کرتے تھے۔

ایک دن اُنہوں نے مجھے فون کیا اور کہا "تم کراچی آجاؤ۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔

میں نے پوچھا "بات کیا ہے؟ میں فوراً نہیں آسکتا۔ یہاں کچھ ایسی مصروفیت ہے کہ فوراً یہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ کچھ پریشان بھی ہوں"۔

کہنے لگے "میں چاہتا ہوں۔ تم ہمارے بینک میں آجاؤ اور کچھ کام کرو۔ مجھے مشورہ دو"۔

میں نے کہا "بینک کے کاموں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف ادبی کام کرسکتا ہوں۔ کسی اور قسم کا کام کرنا میرے بس کی بات نہیں"۔

کہنے لگے "میں تم سے ادبی کام ہی کروانا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ایک فاؤنڈیشن قائم کرنے کا ہے جو ادبی اور کلچرل کام کرے گا"۔

میں نے کہا "اچھا، اس کے بارے میں کسی وقت بیٹھ کر بات کریں گے۔ فی الوقت میں کراچی نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں یونیورسٹی میں بعض ایسی میٹنگیں ہیں جن میں میرا شریک ہونا ضروری ہے۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن آئندہ جب بھی تم وقت نکالو گے تو بیٹھ کر اس موضوع پر مُفصّل باتیں کریں گے"۔

کہنے لگے "اچھا میں جلد ہی لاہور کا پروگرام بناؤں گا۔ انشاءاللہ تم سے مفصل باتیں ہوں گی"۔

لیکن عجب اتفاق ہوا کہ چند مہینے تک آغا حسن سے میری مُفصّل ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ کبھی میں ایران چلا گیا، کبھی ہندوستان اور کبھی پاکستان میں پشاور یا اسلام آباد۔ وہ لاہور آئے لیکن میں یہاں موجود نہیں تھا۔

بالآخر میرے ایک خط کے جواب میں اُنھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے ایک ذاتی قسم کا خط لکھا جس میں اپنے ما فی الضمیر کی وضاحت کی انھوں نے لکھا:۔

لندن
۱۲ر ستمبر ۱۹۸۴ء

"ڈیئر عبادت! خط موصول ہوا۔ میں اکتوبر کے وسط میں کراچی آؤں گا۔ تفصیلاً گفتگو کروں گا۔

کام سے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ادبی نوعیت کا ہونا چاہیئے جس کی تجویز تمہارے ذمّے ہے۔

تنخواہ معقول ہوگی۔

اُمید ہے تم سب خیریت سے ہوگے۔!

تمہارا

آغا حسن

لیکن اسی زمانے میں تین سال کے لئے مجھے انقرہ یونیورسٹی میں اُردو اور مطالعۂ پاکستان کے پروفیسر کی حیثیت سے ترکی جانا پڑا۔ وہاں سے میں آغا حسن کے ساتھ خط وکتابت کرتا رہا۔ انہیں میرا انقرہ جانا پسند نہیں تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ حکومت پاکستان کا احترام ضروری تھا۔ ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کے پیشِ نظر میں نے کچھ عرصے کے لئے وہاں جانا مناسب سمجھا۔ ڈھائی تین سال وہاں رہا، اور پاکستان کے لئے کام کیا۔

ترکی میں میرا قیام مفید اور دلچسپ رہا۔ وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کے مجھے مواقع ملے۔ پاکستان اور مسلمانوں سے وہاں ایسی محبت دیکھی جو مجھے دُنیا میں کہیں اور نظر نہیں آئی۔ لوگ اتنے خوش شکل، خوبصورت، ایسے مہذب اور شائستہ، اس درجہ سادہ اور معصوم، اس قدر محبت کرنے والے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سب میرے خاندان کے افراد ہیں۔ میرے ہم وطن ہیں، میرے بھائی ہیں۔ میرے شناسا اور دوست ہیں۔ طلباء و طالبات ایسے مہذب، شائستہ اور محبت کرنے والے کہ میں نے کسی اور مُلک میں نہیں دیکھے۔ اس لئے میرا دل وہاں لگ گیا، اور میں تقریباً تین سال تک وہاں رہا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں میں لاہور آجاتا تھا۔

آخری دفعہ جب میں لاہور آیا تو آغا حسن کو کسی طرح اس بات کا علم ہوگیا کہ حکومت پاکستان نے میری اس ملازمت میں غیر معینہ مُدّت کے لئے توسیع کردی ہے، اور شاید میں پھر کچھ عرصے کے لئے انقرہ واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن آغا حسن میرے انقرہ جانے سے نہ تو پہلے خوش تھے نہ اب خوش ہوئے اس لئے انہوں نے مجھے لکھا:۔

عبادت! تمہارا خط ابھی ملا۔ خوشی ہوئی۔ پُرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ میں اب کچھ عرصے تک لاہور نہ آسکوں گا۔ اگست میں کراچی آؤں گا۔ تم سے رابطہ قائم کروں گا، اور ملنے کی کوئی صورت ضروری نکالوں گا۔ میری رائے میں تم انقرہ قطعی نہ جاؤ۔ اِس عُمر میں گھر سے دُور رہنا باعثِ اذیت ہوگا۔ اور پھر انقرہ ایسی جگہ! والسلام

تمہارا آغا حسن

۲۲ر جولائی ۱۹۸۴ء

میں خود بھی اب انقرہ جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہاں تنہائی بہت تھی۔ دو ڈھائی سال میں نے وہاں گذار لئے تھے، اور علمی تعلیمی اور ادبی نوعیت کا جو کام مجھے وہاں کرنا چاہیئے تھا، وہ میں نے کر دیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہاں اب میری جگہ کوئی معقول آدمی جائے اور وہ اس کام کو آگے بڑھائے جو میں نے وہاں کیا تھا۔ اب جو آغا حسن کا یہ خط مجھے ملا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ انقرہ نہیں جاؤں گا۔ اس لئے حکومت پاکستان نے جو توسیع میری ملازمت کی تھی، اُس کے بارے میں اُن لوگوں سے معذرت کر دی اور لکھ دیا کہ میں وہاں جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ آغا حسن کو بھی لکھ دیا کہ میں نے تمہارے منع کرنے کی وجہ سے انقرہ جانے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ وہ میرے اس فیصلے سے خوش ہوتے۔

اس کے بعد اُنہوں نے میرے لئے وہ کچھ کیا جو ایک سچّا اور مخلص دوست ہی کسی کے لئے کر سکتا ہے۔ یوں سمجھیئے کہ اُنہوں نے مجھے دُنیا کے تمام بکھیڑوں، ناشروں اور پبلشروں کی بیشتر بازیوں اور یونیورسٹی کی سفّاکیوں اور چیرہ دستیوں سے محفوظ اور بے نیاز کر دیا اور میں اطمینان اور سکون سے اپنے ادبی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہر سال میری تین چار ادبی کتابیں شائع ہونے لگیں، اور چار پانچ سال میں اِن کتابوں کی تعداد پندرہ کے قریب ہو گئی۔ اِن میں میر تقی میر، حضرت خواجہ میر دردؒ، جہانِ میر، جہانِ غالب، نقدِ غالب، جلوہ ہائے صد رنگ،

یادِ عہدِ رفتہ (خودنوشت)، آزادی کے سائے میں، یارانِ دیرینہ، بلاکشانِ محبت، ترُکی میں دو سال، دیارِ حبیبؐ میں چند روز، فیض کے پی ایچ ڈی تھیسز کا خاکہ، غزالانِ رعنا، شجرہائے سایہ دار، اور اورینٹل کالج میں تیس سال قابلِ ذکر ہیں۔

آج کل میں ایک دس سالہ ادبی منصوبے پر کام کر رہا ہوں۔ اس میں بُنیادی حیثیت اُردو کے اہم مصنفین کی ادبی سوانح کو حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدیم وجدید مُصنفوں کے خطوط کی ترتیب وتدوین بھی ہے۔ کچھ نادر و نایاب قدیم قلمی نسخوں کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت بھی ہے۔ اس پر خاصا کام ہو چکا ہے۔ اگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو اُردو کی ادبی تاریخ اور اسلامیانِ ہند کے تہذیبی وعلمی کارناموں پر ایسا مواد جمع ہو جائے گا جس کی وجہ سے اُردو زبان وادب اور مسلمانوں کی ذہنی وفکری اور تخلیقی وعلمی تاریخ کو از سرِ نو کسی اور طریقے سے ترتیب دینے کی ضرورت محسوس کی جائے گی اور نادر و نایاب مواد کے پیشِ نظر یہ کام آسان ہو جائے گا۔ اور اس کا سہرا آغا حسن عابدی کے سر ہوگا۔ کیونکہ اُنھوں نے میرے لئے ایسے سازگار حالات پیدا کئے جن کے بغیر اس قسم کا کام ہو نہیں سکتا۔

آغا حسن عابدی ہیں تو بینکنگ کے ماہر لیکن اُن کا مزاج علمی اور ادبی ہے۔ دراصل یہ ذوق انہیں اپنے خاندان سے ورثے میں ملا ہے، اور جس ماحول میں اُن کی ذہنی نشو و نما ہوئی ہے، اُس کے اثرات بھی اُن پر بڑے گہرے ہیں۔ کچھ انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنے کا بھی اثر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر قوم اپنے علمی ادبی اور تہذیبی کارناموں سے پہچانی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت علم وادب اور تہذیب وثقافت کی آبیاری کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں کسی نہ کسی طرح نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کو نوازا ہے اور اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی ہے۔ نہ جانے کتنے ادیبوں کو اُنھوں نے ملازمتیں دی ہیں، نہ جانے کتنے ادیبوں کا علاج کروایا ہے، اور اس کے لئے انہیں بیرون ملک بھیجا ہے۔ نہ جانے کتنے ادیبوں کی تحریروں کی طباعت واشاعت کے لئے سرمایہ فراہم کیا ہے۔ اس

کام کے لئے انہوں نے فاؤنڈیشن اور ٹرسٹ قائم کئے ہیں۔ اس اعتبار سے اُن کی اور اُن کے بینک کی کارکردگی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

وہ صحیح قسم کے پاکستانی اور پاکستان کی قومی زبان اُردو کے شیدائی ہیں۔ اُنہوں نے اکثر مجھ سے اس قسم کی باتیں کی ہیں کہ پاکستان ہمارا وطن ہے، اور پاکستانی ہونا ہی ہماری شناخت ہے، دُنیا کے مختلف ممالک میں ہماری جو عزّت ہے وہ پاکستانی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لئے ہم دُنیا میں جہاں بھی جائیں ہمیں اپنے پاکستانی ہونے کا اظہار کرنا چاہیئے، اور اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تہذیب کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ ایسا کئے بغیر ہمارا تشخص برقرار نہیں رہتا۔

اُنہوں نے اپنے فکر و عمل سے اس کو ثابت کیا ہے۔ وہ چاہتے تو دُنیا کے کسی مُلک کی شہریت حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کا خیال کبھی بھی اُن کے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ آج بھی وہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو پاکستانی کہتے ہیں، اور پاکستان کے لئے کام کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ گذشتہ چالیس سال میں اُنہوں نے پاکستان کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ پاکستان کا ایک ایسا باب ہے جو سُنہرے حروف میں لکھنے جانے کے قابل ہے۔ وہ ہمیشہ آڑے وقت میں پاکستان کے کام آئے ہیں، اور ہمیشہ پردے کے پیچھے رہ کر اُنہوں نے وطنِ عزیز کی دامے، درمے، سخنے مدد کی ہے۔ اس کی تفصیل تو مستقبل کا مؤرخ ہی لکھے گا۔ کیونکہ تمام باتیں ریکارڈ پر ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اِن کے چہرے سے نقاب اُٹھانا مورخ ہی کا کام ہے اس کے لئے اس کو پاکستانی زندگی کے مختلف شعبوں کی ارتقائی کیفیت کا جائزہ لینا ہوگا، اور اس طرح کچھ ایسے حقائق سامنے آئیں گے جن سے آشنا ہو کر لوگوں کو حیرت ہوگی۔

اُردو کے کام میں آغا حسن ہمیشہ ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض واقعات تو ایسے ہیں جن کو میں کبھی بھی بُھلا نہیں سکتا۔

میرے ایک شاگرد لندن میں رہتے ہیں۔ شاعر ہیں، اور اُردو کا کام کرتے ہیں۔ چند سال ہوئے اُنہوں نے لندن میں ایک اُردو کانفرنس منعقد کرنے کا ڈول

ڈالا۔ میرے پاس لاہور آئے، اپنے اس منصوبے کا مجھ سے ذکر کیا، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے لئے میں آغا حسن کو توجہ دلاؤں۔ میں نے اُردو کی محبت کے پیشِ نظر آغا حسن کو اس سلسلے میں خط لکھ دیا، اور اُنھوں نے اچھی خاصی رقم انہیں دے دی۔ لیکن انہوں نے اس رقم کو غلط طور پر استعمال کیا۔ کانفرنس بھی نہیں کی، اور پیسہ بھی ضائع کیا۔ مجھے اس کا علم ہوا تو بہت افسوس ہوا۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کر سکتا تھا کہ شرمندگی کا اظہار کروں۔ اپنی قوم کے بیشتر لوگ ایسے ہی غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ آغا حسن ان لوگوں کے شکوہ سنج ہیں اور اکثر دَبی زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لئے بھی اپنے دروازے بند نہیں کرتے۔

چند سال ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے پاکستان، ہندوستان کے شعبے میں اُردو اور مطالعۂ پاکستان کی ایک پروفیسر شپ قائم ہو جائے تو ان موضوعات پر تدریس و تحقیق کا کام باقاعدگی کے ساتھ ہو سکے گا۔ چنانچہ میں نے حکومت پاکستان کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ وزارت تعلیمات اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اس سلسلے میں لکھا۔ اِن اداروں نے اصولی طور پر میری اس تجویز کو منظور بھی کر لیا لیکن جب یہ معاملہ فنانس میں منظوری کے لئے گیا تو فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے منظور نہ ہو سکا، اور اس طرح یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

اب میں نے یہ سوچا کہ آغا حسن کو اس کی طرف توجہ دلاؤں۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں اُنہیں مفصل خط لکھا۔ اور اپنے دوست رالف رسل سے کہا کہ وہ لندن میں آغا حسن سے ملیں، اور اس منصوبے کی تفصیل اُنہیں بتائیں۔

رالف اُردو کے عاشق ہیں اور اُردو کے لئے ہر کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں آغا حسن سے ملے اور طویل مذاکرات کے بعد اُنھوں نے آغا حسن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں اُردو کی چیئر قائم کرنے کے لئے مالی امداد دینے کو تیار رہیں۔

آخری مُلاقات میں اُنہوں نے پچاس ہزار پونڈ کا چک رسل کو اس کام کے لئے دے دیا۔ یہ چک مل گیا تو رسل نے لندن یونیورسٹی کے ارباب اختیار سے اس سلسلے میں بات کی۔ یہ لوگ اصولی طور پر اس رقم کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن شرط یہ لگائی کہ اُردو کی اس پروفیسر شپ کا اشتہار دیا جائے گا، اور اس پر کسی انگریز کا تقرر ہو گا۔

رسل کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اُن کی خواہش تو یہ تھی کہ بغیر اشتہار کے میرا تقرر اس پروفیسر شپ پر ہو جائے تا کہ ہم دونوں مل کر وہاں اُردو کا کام کریں۔ لیکن جب انہیں لندن یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے فیصلے کا علم ہوا تو وہ پھر آغا حسن کے پاس گئے۔ اُنہیں اس فیصلے سے آگاہ کیا، اور وہ چک انہیں واپس کر دیا۔ لیکن آغا حسن نے کہا کہ وُہ اس چک کو واپس لینے کے لئے تیار نہیں ہیں، کیونکہ یہ اُن کے اصول کے خلاف ہے"۔

رالف نے مجھے اس کی اطلاع دی۔ بالآخر رسل سے طویل ملاقاتوں کے بعد آغا حسن نے یہ فیصلہ کیا کہ اس رقم سے لندن میں اُردو سنٹر کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا جائے جو اُردو زبان وادب کا کام کرے۔

یہ ہے لندن میں اُردو مرکز کے قائم ہونے کی کہانی! کئی سال سے یہ اُردو سنٹر لندن میں کام کر رہا ہے، اور اس کے زیر اہتمام بڑے بڑے جلسے ترتیب دیئے جاتے ہیں جس میں اُردو کے مشہور شاعر اور ادیب شریک ہوتے ہیں۔ ان جلسوں سے لندن میں اُردو زبان اور ادب کا خاصا ماحول پیدا ہوا ہے۔

لندن اور انگلستان کے دوسرے علاقوں میں خاصی تعداد اُردو سے دلچسپی لینے والوں کی ہے۔ اس سنٹر کے قائم ہونے سے اِن لوگوں کو ایک پلیٹ فارم مل گیا ہے جہاں سے وہ اُردو کی آواز بلند کر سکتے ہیں، اور لوگوں میں اُردو زبان وادب سے دلچسپی لینے کا ماحول بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

اور اس کا سہرا بی۔ سی۔ سی۔ آئی کے صدر آغا حسن عابدی کے سر ہے۔

میرے خیال میں اس اُردو سنٹر کا قیام آغا حسن اور بی۔سی۔سی۔آئی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ اُردو زبان وادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ لیکن اس کی تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ اس کے زیر اہتمام سنجیدہ قسم کا علمی کام بھی ہونا چاہیئے۔ اُردو کے جلسوں کا ترتیب دینا اہم کام ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے زیرِ اہتمام اُردو زبان وادب پر تحقیق وتنقید کا کام بھی کرنے کی ضرورت ہے۔ لندن میں اس کام کے لئے اتنا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد موجود ہے جس پر اگر کام کیا جائے تو اُردو زبان وادب اور اسلامیانِ ہند کی تہذیبی تاریخ کو از سرِ نو نئے انداز سے لکھنے کے لئے زمین تیار ہو سکتی ہے۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور انگلستان کی دوسری لائبریریوں میں برعظیم ہندو پاکستان میں چھپا ہوا ایک ایک پُرزہ محفوظ ہے۔ اس مواد سے کام لینا چاہیئے، اور میری رائے میں اس کو از سرِ نو شائع کر دینا چاہیئے تاکہ یہ مواد مورخوں کی دسترس میں ہو، اور وہ اس کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کی تہذیب اور اُن کے ادب کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کرنے میں کامیاب ہوں۔

آغا حسن کو اس طرح کے کاموں سے قلبی سکون حاصل ہوگا، اور وہ فخر سے یہ بات کہہ سکیں گے ؎

حاصلِ عُمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اگر میں یہ بات کہوں کہ جہاں تک علم وادب کی خدمت کا تعلق ہے، اس دَور میں آغا حسن نے اودھ کے نواب آصف الدولہ کی یاد تازہ کر دی ہے تو ایسا کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اودھ کے نواب آصف الدولہ کی سخاوت بھی مشہور تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے زمانے میں لکھنؤ کی سرزمین پر یہ فقرہ عام لوگوں کی زبان پر رہتا تھا "جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ"۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب اودھ میں قحط پڑا تھا تو انھوں نے ضرورت مند شرفا کی اس طرح مدد کی تھی کہ امام باڑہ

تعمیر کروایا تھا، اور اس کی تعمیر کا کام رات کے وقت ہوتا تھا تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ لکھنؤ کے شرفا، جو قحط کی وجہ سے بھوک اور ناداری سے دوچار تھے، وہ اس امام باڑے کی تعمیر میں شریک ہوتے ہیں اور رات کی تاریکی میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آصف الدولہ نے ایک بینک بھی قائم کیا تھا جو اُس زمانے میں ایک نئی بات تھی۔ آغا حسن نے بھی اپنے محدود دائرے میں رہ کر لوگوں کے ساتھ نہ جانے کیا کیا کچھ کیا ہے۔ بے شمار واقعات ایسے ہیں جو اس سلسلے میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف دو واقعے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اِن سے آغا حسن کی دریا دلی اور انسان دوستی کا اندازہ ہوگا۔

بی۔سی۔سی۔آئی کے ایک اہم اور ذمہ دار افسر نے مجھے بتایا کہ ایک دن صبح صبح لندن سے آغا حسن کا فون آیا۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ایک صاحب دوپہر تک آپ کے پاس آئیں گے۔ اُن کی بہن بہت بیمار ہیں۔ اس بیماری کا علاج صرف لندن میں ہو سکتا ہے۔ اُنہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا ہے اور اپنی پریشانی کی تفصیل مجھے سُنائی ہے۔ آپ اُنہیں پانچ ہزار پونڈ میری طرف سے دے دیجئے تاکہ وہ اپنی بیمار بہن کا لندن آکر علاج کروا سکیں۔ میرے ذاتی حساب میں سے یہ رقم اُنہیں دے دیجئے۔ وہ صاحب دوپہر کو میرے پاس آئے۔ میں نے عابدی صاحب کی ہدایت پر عمل کیا، یہ رقم انہیں دے دی، اور وہ اپنی بہن کو لے کر علاج کے لئے اطمینان سے لندن روانہ ہو گئے۔

پھر اُنہوں نے ایک واقعہ اور سُنایا۔ کہنے لگے "ایک دن میں نے کسی کام سے آغا صاحب کو لندن فون کیا۔ باتیں ہوئیں۔ دوران گفتگو میں نے کہا کہ یہاں لاہور میں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔ میرے پاس کچھ لوگ آئے تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ہم اس کار خیر میں حصہ لیں۔ میں نے اُن سے ابھی کوئی وعدہ نہیں کیا۔ آپ کا مشورہ اور اجازت اس معاملے میں ضروری ہے۔ آپ فرمائیے کہ کیا کیا جائے؟"

آغا حسن نے کہا "اگر مسجد آپ نے دیکھ لی ہے اور آپ اس کی تعمیر کے کام سے مطمئن ہیں تو میرے ذاتی حساب میں سے پانچ لاکھ روپے کی رقم اس کارِ خیر میں دے دیجئے۔"

اور میں یہ سُن کر سوچتا رہا کہ کوئی فرشتہ ہی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آغا حسن کی شخصیت کی یہ خصوصیات کسی طرح فرشتوں کی خصوصیات سے کم نہیں ہیں۔ انسان کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرتا ہے تو ہزار بار سوچتا ہے کہ ایسا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ کم ظرف ہو تو کسی نہ کسی طریقے سے اس کا ڈھنڈورہ بھی پیٹتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو، اور وہ اپنے اس کام سے جانا پہچانا جائے۔ آغا حسن نے بے شمار نیک کام کئے لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ گوشۂ گُم نامی ہی میں رکھا اور کبھی کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ اِسی میں اُن کی بڑائی ہے۔

آغا حسن کو پبلسٹی اور شہرت سے نفرت ہے۔ وہ گوشۂ گمنامی میں رہ کر کام کرنے کے عادی ہیں۔ زندگی میں وہ ترقی کی جن منزلوں تک پہنچ گئے ہیں، وہاں پہنچ کر ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت اور ناموری دُور دُور تک پھیلے۔ اخباروں اور رسالوں میں اُس کی تشہیر ہو۔ لوگ اُس کے گُن گائیں اور تعریفیں کریں۔ بعضوں کے ہاں تو یہ کیفیت ایک نفسیاتی بیماری کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور وہ اس سلسلے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کرتے ہیں۔ آغا حسن نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ تو ہمیشہ پردے کے پیچھے ہی رہے اور کام کرتے رہے۔ اس لئے کہ اُن کے خیال میں کام ہی انسان کا انعام ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی بینکنگ کی زندگی میں آغا حسن نے بے شمار نوجوانوں کو روزگار سے لگایا، انہیں ملازمتیں دیں، اور اس طرح بے شمار خاندانوں کی پرورش کا سامان پیدا کیا۔ خاص طور پر نیک، شریف، محنتی اور دیانت دار لوگوں کی وہ ہمیشہ تلاش میں رہتے تھے۔ لیکن اس معاملے میں آداب واخلاق اور قواعد وضوابط کی پابندی اُن کے نزدیک ضروری تھی۔ وہ کبھی اپنا حکم نہیں چلاتے تھے۔ بلکہ جس برانچ

میں بھی کسی کو ملازمت دینی ہوتی تھی تو اُس برانچ کے سربراہ کی طرف رجوع کرتے تھے اور اس سے کہتے تھے کہ "یہ آدمی اچھا ہے، تم اس کو ملازم رکھ لو۔ تمہارے ایما کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ میں تو تم سے صرف اس کی سفارش کر رہا ہوں۔ یہ گارنٹی دے رہا ہوں کہ یہ آدمی اچھا ہے، اور تمہارے لئے، اور ہم سب کے لئے مفید ثابت ہو گا"۔ یہ اُن کی وضعداری اور تہذیب و شائستگی کی بات تھی، ورنہ وہ اپنے ماتحتوں کو بھونڈے طریقے سے اس کا حکم بھی دے سکتے تھے لیکن اُنھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

گُذشتہ چند سال سے آغا حسن نے لوگوں سے مِلنا جُلنا کم کر دیا تھا۔ کم آمیز تو خیر وہ ہمیشہ سے تھے۔ لیکن چند سال سے اُن کی اس کم آمیزی میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مختلف کاموں میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ اُن کے پاس وقت نہیں تھا۔ شب و روز کام کرتے تھے، اور جب بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کام نہیں کر رہے ہیں تب بھی وہ مصروف رہتے تھے۔ سوچتے تھے، منصوبے بناتے تھے اور خواب دیکھتے تھے، اور اِن منصوبوں اور خوابوں کو عملی شکل دینے کا خیال اُنہیں ہر وقت مصروفِ کار رکھتا تھا۔

اس صورتِ حال کی وجہ سے اُن کے عملے کے لوگ تک دبی زبان سے کبھی کبھی یہ کہتے تھے کہ "آغا صاحب ہم سے مِلتے کم ہیں، وقت کم دیتے ہیں"۔ لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ اُن کے پاس وقت نہیں ہے اور وہ ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ اس لئے کبھی شکایت کا کوئی لفظ اُن کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آغا حسن نہایت وضع دار اور با اخلاق انسان ہیں۔ اُن کی کوئی مجبوری ہے جس کی وجہ سے اُنھوں نے مِلنا جُلنا کم کر دیا ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُن کا یہ رویہ صرف اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہی نہیں ہے، اپنے عزیز دوستوں تک کے ساتھ بھی اُن کا مِلنا جُلنا کم ہو گیا ہے۔

یہ اُن کی کم آمیزی کی انتہا تھی، اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اِسی صورتِ حال نے اُنہیں بیمار کر دیا۔ اُن پر کام کا بوجھ بہت تھا۔ وہ مصروف بہت تھے۔ تفریح اُن

کی زندگی میں کوئی تھی نہیں ۔ انگلستان میں رہتے تھے لیکن انہیں کبھی انگلستان کے لوگوں کی طرح HOLIDAY منانے کا خیال نہیں آیا۔ لے دے کے اُن کے خاندان کے چند افراد تھے جن کے ساتھ وہ وقت گذارتے تھے، اور یہی اُن کی تفریح تھی۔ اُن کے دوست احباب بہت کم تھے۔ اِن کو انگلیوں پر گِنا جا سکتا تھا۔ وہ کسی کلب کے ممبر نہیں تھے۔ کبھی کہیں تفریح کے لئے نہیں جاتے تھے۔ تھیئٹر اور سینما تک سے اُنہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ادب کا وہ نہایت سُتھرا ذوق رکھتے تھے، شعروشاعری سے اُنہیں دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ادبی کتاب پڑھ لیتے تھے، لیکن منصبی مصروفیات اس میں بھی حائل رہتی تھیں۔ مشین بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہو تو اُس کی کارکردگی میں فرق آجاتا ہے۔

آغا حسن کی علالت کا سبب یہی ہوا۔ دن رات کام کام اور کام ـــ اور اس کام میں انہیں یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ اُن کی صحت پر اس کا اثر ہو رہا ہے۔ معمولی تکلیفوں کی اُنہوں نے پروا نہیں کی، اور معمول کے مطابق کام کرتے رہے۔ قوت ارادی نے ہمیشہ اُن کا ساتھ دیا۔ وہ پختہ عزم و ارادے والے آدمی اور دھن کے پکّے انسان تھے۔ اس لئے کئی سال تک معمولی تکلیفوں کو برداشت کرتے رہے۔ کسی سے اِن کا ذکر تک نہیں کیا۔ سفر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ لیکن بالآخر اُن کی یہ تکلیفیں رنگ لائیں۔

گذشتہ سال وہ لاہور آئے اور پرل کانٹی نینٹل میں قیام کیا تو ایک رات اُن کی تکلیف میں اضافہ ہوا، اور انہیں ہسپتال جانا پڑا۔

میں شام کو پرل کانٹی نینٹل میں اُن سے ملنے کے لئے گیا تو یہ اطلاع ملی کہ رات کو انہیں تکلیف کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے ہسپتال جانا پڑا۔ وہاں سے میں شیخ زید ہسپتال گیا، لیکن دریافت کرنے سے معلوم یہ ہوا کہ اُن سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے شیخ زید تک کو اُن سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ مایوس ہو کر واپس آیا، اور ٹیلی فون کر کے اُن کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ اطلاع ملی کہ اب بہتر ہیں لیکن ڈاکٹروں نے کسی کو اُن سے مُلاقات کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس لئے کہ انہیں آرام

کی ضرورت ہے۔ کئی روز اسی طرح گذرے۔ بالآخر اُن کی بیگم نے مجھے خط لکھا اور یہ خوش خبری سُنائی کہ اب وہ ٹھیک ہیں، اور اُن کی صحت تیزی سے معمول پر آ رہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر ابھی یہ نہیں چاہتے کہ اُن سے زیادہ لوگ ملیں۔ کیونکہ اس طرح اُن پر بوجھ پڑے گا۔ مجھے اس خبر سے اطمینان ہوا، اور میں اُن کی مُکمل صحت یابی کے لئے دُعا کرتا رہا۔

پھر ایک دن یہ اطلاع ملی کہ وہ لندن چلے گئے۔ میں یہ سُن کر خوش ہوا کہ وہ سفر کے قابل ہو گئے اور ڈاکٹروں نے اُنہیں سفر کی اجازت دے دی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

لندن میں اُن کا آپریشن ہوا، لیکن وہ کئی مہینے ہسپتال میں رہے۔ اب یہ تازہ ترین اطلاع ملی ہے کہ خدا کے فضل وکرم سے وہ بہتر ہیں۔ گھر آ گئے ہیں، اور اُن کی صحت ٹھیک ہے لیکن ابھی اُنہیں کام کرنے کی اجازت نہیں ملی ہے۔

میں اُن کے لئے ہر وقت دعا کرتا ہوں، اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ ہر وقت زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اُنہیں مکمل صحت عطا فرمائے اور ہمیشہ تندرست و توانا اور خوش وخرم رکھے!

آغا حسن ایک عجیب وغریب شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کی زندگی محبت اور خدمت سے عبارت ہے وہ قدیم تہذیبی روایت کی ایک حسین علامت ہیں۔ اُنہوں نے لکھنؤ کے ایک شریف خاندان میں آنکھ کھولی اور ایک ایسے ماحول میں اُن کی نشو ونما ہوئی جو اعلےٰ اخلاقی اور تہذیبی اقدار کا حامل تھا۔ اُن کے والد صاحب پُرانی وضع کے نہایت سادہ اور معصوم قسم کے انسان تھے۔ اُنہیں تہذیب و شرافت، نیکی اور اخلاقی اقدار کا پُتلا کہا جائے تو بے جا نہیں۔ اُن کے سائے میں آغا حسن کی نشو ونما ہوئی، اور اُنہوں نے اُن کی کچھ اس طرح تربیت کی کہ اُن کی شخصیت میں بچپن ہی سے تہذیب وشرافت اور اعلےٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کا رنگ اس طرح رچ گیا کہ وہ زندگی بھر اُن کے ساتھ رہیں، اور ان اقدار نے اُنہیں جاذب نظر شخصیت بنا دیا۔ اُن کی

باتوں میں ایسی دِلکشی اور اُن کے لہجے میں ایسی شیرینی پیدا ہوئی جس نے شہد و شکر تک کو مات کر دیا۔ اُن کے گھر کا ماحول ایسا تھا جس نے اُنہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا، اور اُن کے اندر ذمہ داری کا ایسا احساس پیدا کیا جس کی وجہ سے زندگی کے ہر دور میں کامیابی نے اُن کے قدم چومے، اور وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

میں نے اُن کے گھر کے ماحول کو دیکھا ہے۔ میرا اُن کے خاندان کے لوگوں سے رابطہ رہا ہے۔ میں اسکول کے زمانے سے لے کر کالج اور یونیورسٹی کے زمانے تک ہر وقت اُن کے ساتھ رہا ہوں۔ ملازمت کے زمانے میں بھی میری اُن کے ساتھ قُربت رہی ہے۔ انہوں نے ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے، اور میں نے اُنہیں اپنی صلاحیتوں کے مطابق صحیح راستوں پر گامزن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ پر اعتماد کیا ہے اور ہمیشہ میری بات مانی ہے۔ وہ دوستوں کے دوست رہے ہیں۔ اخلاص اور محبت اُن کی شخصیت کے نمایاں ترین اوصاف ہیں، اور اسی کی بدولت میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر دور میں ایک جاذب نظر شخصیت رہے ہیں۔ جس شخص سے بھی اُن کا رابطہ رہا ہے، وہ اُن کا گرویدہ ہو گیا ہے۔ اس گرویدگی کے میں نے ایسے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ میں اس عجیب و غریب شخص کی ساحری کا قائل ہو گیا ہوں۔ اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ شخص ایک ساحر ہے۔

آغا حسن ہمیشہ سے طبعاً ایک جذباتی اور رومانی انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ انہیں سنگینی کا احساس دلاتا تھا، اور وہ ناسازگار حالات سے متاثر ہونے کے باوجود اُن سے بنرد آزما ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اُن کے تخیّل کی پرواز بہت بلند تھی۔ وادیٔ خیال کو مستانہ طے کرنا اُن کا مزاج تھا۔ وہ ہمیشہ خواب دیکھتے تھے، اور اِن خوابوں کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالنا اُن کی طبیعت کی نمایاں ترین خصوصیت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ زندگی کے سفر میں ہر منزل اور ہر موڑ پر کامیابی اور کامرانی

نے اُن کا استقبال کیا اور محبت، عزّت، دولت اور شہرت نے انہیں ہر اعتبار سے نوازا۔ وہ ترقی کی انتہائی بلندیوں سے ہم کنار ہوئے، اور ایسی منزلوں پر پہنچے جہاں تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تو بلند پرواز تخیّل، مُصمم عزم و ارادہ، اَن تھک محنت و جفاکشی، جذب صادق، و سوز دروں، دیانت داری و پاک دامانی، بے اندازہ مُحبت، بے لوث خدمت، کام کرنے کی دھن اور لگن تہذیب و شائستگی اور بلند اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آغا حسن کو کردار کی اِن خصوصیات سے پوری طرح نوازا، اور اُنہیں زندگی میں وہ سب کچھ دیا جس کی ہر انسان کو تمنّا ہوتی ہے۔

اس عہد پُر آشوب اور انسانی و اخلاقی اقدار کے اس دور شکست و ریخت میں آغا حسن اعلےٰ اور ارفع انسانی اور اخلاقی اقدار کے بہت بڑے علم بردار ہیں۔ اُنہوں نے اپنے فکر و عمل سے ان اقدار کو عام کرنے کی کوشش کی ہے، اور اِن اقدار کی فلسفیانہ تحلیل کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے وہ اپنے عزیزوں، دوستوں، رفیقوں اور ما تحتوں کو ان اقدار کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں اور اس کا مقصد معاشرے اور ماحول کی کثافتوں کو پاک صاف کرنا اور انسانی زندگی کو اس کی اعلےٰ اور ارفع ترین منزلوں سے ہم کنار کرنا ہے تاکہ یہ زندگی فردوس ارضی کا ایک نمونہ بن جائے۔

آغا حسن میرے عزیز دوست ہیں۔ بلکہ بقول خود اُن کے ہم ایک دوسرے کے جگری دوست ہیں ایک زمانہ میں نے اُن کے ساتھ گذارا ہے۔ ایک عمر اُن کے ساتھ بسر کی ہے۔ میرے اُن کے دوستانہ اور برادرانہ روابط تقریباً نصف صدی پر پھیلے ہوئے ہیں۔ میں نے اُنہیں بہت قریب سے دیکھا ہے، اور وہ مجھے ہمیشہ ایک عظیم انسان، ایک مخلص دوست، ایک بلند پایہ منتظم، ایک مہذب، شائستہ اور با اخلاق شخص نظر آئے ہیں۔ ان خصوصیات نے اُنہیں انسان سے زیادہ ایک فرشتہ بنا دیا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ انسان کے روپ میں ایک فرشتہ ہیں۔

میں اُن کی دوستی کو اپنی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں، اور ہر وقت اُن کی صحت وسلامتی، عافیت ومسرّت اور خوش حالی وشادمانی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اُن کی یاد میرے دل میں ہمیشہ دیئے سے روشن کرتی ہے اور میں ہر لمحہ اُنہیں یاد کر کے، تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ غالب کا یہ شعر پڑھتا رہتا ہوں ؎

وہ سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

پروفیسر سیّد نور الحسن

گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کی اسکول کی جماعتوں میں میرے کلاس فیلو نو خاصی تعداد میں تھے لیکن جن لوگوں سے میری دوستی تھی اُن میں مرزا کمال بیگ، سید صادق حسین، سید آغا حسن عابدی اور سید نور الحسن کے نام سرفہرست ہیں۔

نور الحسن چوتھے درجے سے لے کر ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ تک تقریباً سات آٹھ سال میرے کلاس فیلو رہے۔ وہ اودھ چیف کورٹ کے چیف جسٹس سر سید وزیرن کے نواسے، یوپی سول سیکرٹریٹ کے سیکرٹری سید عبدالحسن صاحب کے صاحب زادے اور مشہور ادیب سید سجاد ظہیر صاحب کے بھانجے تھے۔ میری اُن سے دوستی تھی، اور ہم کالج میں خاصا وقت ایک دوسرے کے ساتھ گذارتے تھے۔ وہ ایسے طالب علم تھے جو کم آمیز ہوتے ہیں، اور جن کو اپنے ساتھیوں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ بے تکلف ہونے کا موقع کم ملتا ہے۔ وہ اپنے خول میں رہتے ہیں اور بڑی مشکل سے کھلتے ہیں۔ نور الحسن بے تکلف تو میرے ساتھ بھی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود اُن سے میری دوستی تھی۔

سُرخ سفید رنگ، بوٹا سا قد، بھرا بھرا جسم مائل بہ فربہی، کبھی نیکر اور قمیص میں ملبوس نظر آتے اور کبھی لمبی شیروانی اور بڑے پائنچوں کے لکھنوی انداز کے پاجامے میں کالج آتے۔

شیروانی کے ساتھ ان کے سر پر لکھنوی وضع کی دو پلّی ٹوپی ضرور ہوتی تھی۔ ہر وقت ہنستے اور مُسکراتے رہتے تھے، اور اپنے مزاج کی کم آمیز کیفیت کے باوجود ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، اور اُن سے مل کر کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کم آمیز آدمی ہیں، اور ملنے جُلنے اور باتیں کرنے سے کترا رہے ہیں۔ اُن کی تہذیبی اقدار اور بلند اخلاقی معیار اِس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اُس زمانے میں بھی اُنہیں لکھنوی تہذیب کا مثالی نمونہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔

نورالحسن کے نانا سر سید وزیر حسن، اُن کی نانی لیڈی وزیر حسن، اُن کے ماموں سیّد علی ظہیر، سیّد حُسین ظہیر، سیّد سجاد ظہیر اور سیّد باقر ظہیر بھی نہایت مہذب، شائستہ اور پڑھے لکھے لوگ تھے۔ علی ظہیر صاحب لکھنؤ کے مشہور و معروف وکیل تھے، سیاست میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ اور یوپی میں کئی بار وزیر بھی رہے تھے —— ڈاکٹر سیّد حسین ظہیر لکھنؤ یونیورسٹی میں کیمسٹری کے پروفیسر اور صدر شعبہ اور سائنس فیکلٹی کے ڈین تھے لیکن سیاست میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ سیّد سجاد ظہیر اپنے عہد کے نامور ادیب، ادب کی ترقی پسند تحریک کے ایک اہم رہنما اور کمیونسٹ پارٹی کے مشہور و معروف کارکن تھے۔ سیّد باقر ظہیر سول سروس کے افسر تھے۔ سر وزیر حسن چیف جسٹس تھے لیکن انہوں نے بھی سیاست میں حصّہ لیا، اور مسلم لیگ کے اہم لیڈروں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ اُن کی کوٹھی وزیر منزل لکھنؤ میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں سیاسی رہنما ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آکر قیام کرتے اور جلسے کرتے تھے۔ لیڈی وزیر حسن بھی سیاست میں ہمیشہ پیش پیش رہتی تھیں اور پبلک جلسوں میں اعلیٰ معیار کی تقریریں کرتی تھیں۔ سر وزیر حسن اور لیڈی وزیر حسن کے داماد سیّد عبدالحسن یوپی سول سروس کے نہایت قابل افسر تھے، وہ مسلمانوں کے مفاد کا بہت خیال رکھتے تھے۔ انسان دوستی کا رنگ اُن کی شخصیت میں اپنی بہار دکھاتا تھا۔

نُورالحسن نے ان بزرگوں کے زیرِ سایہ پرورش پائی، اور بچپن ہی سے اس ماحول کو دیکھا جو اُن کے آس پاس موجود تھا۔ اسی ماحول نے اُن کے اندر علم اور تعلیم سے دلچسپی پیدا کی۔ اسی ماحول نے اُن کے ہاں سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ اسی ماحول نے انہیں آداب فرزندی

سکھائے اور بزرگوں کی عزّت کرنے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا درس دیا۔ اس ماحول نے اُن کے اندر انسان دوستی کے جذبات کو اُبھارا، اور سیاست کے پیچ وخم سے انہیں آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ اس وقت کی زندگی کے اِن تمام پہلوؤں سے دلچسپی لینے لگے۔

انٹرمیڈیٹ تک نورالحسن جوبلی کالج لکھنؤ میں میرے کلاس فیلو رہے۔ اس کے بعد وہ الہٰ آباد چلے گئے۔ الہٰ آباد یونیورسٹی سے انہوں نے بی۔ اے کیا، اور پھر تاریخ میں ام۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ اُن کا خاص موضوع تھا۔ اس موضوع سے اُن کی دلچسپی ام۔ اے کرنے کے بعد انہیں آکسفورڈ لے گئی۔ وہ نیو کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے اور تین چار سال وہاں رہ کر اُنہوں نے اسلامیانِ ہند کی تاریخ پر ڈی۔ فِل کی ڈگری لی۔ ڈاکٹریٹ کے بعد وہ وطن واپس آئے، اور انہیں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں لکچرشپ مِل گئی، اور اس زمانے کے تاریخ کے مشہور عالم پروفیسر سوکمار بینرجی، ڈاکٹر نندلال چیٹرجی اور ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی کے ساتھ اُنہیں کام کرنے کا موقع مِلا۔ کئی سال وہ لکچرار کی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسٹی میں کام کرتے رہے۔

نورالحسن کے الہٰ آباد جانے کے بعد میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اور وہاں سے اُردو اور انگریزی میں بی۔ اے آنرز اور ام۔ اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کرنے میں مصروف ہوگیا۔ پڑھانے کا کچھ کام بھی مجھے مِل گیا، اور اس طرح وقت گذرنے لگا۔ نورالحسن سے اس زمانے میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، اور وہ اس فکر میں رہے کہ مجھے کسی طرح لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کی لکچرشپ مِل جائے۔ اس کے لئے وہ اپنے طور پر در پردہ کوشش کرتے رہے لیکن اس کی تفصیل انہوں نے مجھے کبھی بتائی نہیں۔

اتفاق سے اسی زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لکچرار کی ایک جگہ نکلی۔ اس کا اشتہار دیا گیا۔ نورالحسن نے مجھ سے کہا کہ "اس جگہ کے لئے درخواست دے دو۔ حالات بظاہر سازگار ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں تھوڑا سا ابتدائی کام Spade Work کر رکھا ہے۔ مجھے کامیابی کی اُمید ہے۔"

میں نے اُن کے کہنے سے لیکچر شپ کے لئے درخواست دے دی۔ نورالحسن کی خواہش تھی کہ اس جگہ پر میرا تقرر ہو جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے اس سلسلے میں اپنی سی پوری کوشش کی۔ مجھے سلیکشن کمیٹی کے ممبروں کے پاس لے گئے۔ اُن سے میرا تعارف کروایا، اور اُن کے سامنے میری تعریفیں کیں۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین، پروفیسر سدھانت، ڈاکٹر رادھاکمل مکرجی، ڈاکٹر وحید مرزا صاحب اور ڈی۔ پی مکرجی سے مجھے مِلایا، اور اُن سے کہا کہ عُبادت میرے عزیز دوست ہیں، بچپن کے ساتھی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان وادب پر معیاری مقالے لکھے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے کام بھی کر رہے ہیں۔ اُردو کی لیکچر شپ کے لئے یہ نہایت مناسب آدمی ہیں"۔ اِن بزرگوں پر نورالحسن کی باتوں کا اثر تو ہوا، اور اُنہوں نے میری حمایت بھی کی لیکن صدر شعبہ نے میرے حق میں رائے نہیں دی اور وہ اپنے مؤقف پر اَڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نورالحسن کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں، اور میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کا لیکچرار نہ ہوسکا۔ لیکن میرے حق میں یہ بہتر ہی ہوا۔ کیونکہ اسی تعلیمی سال میں دہلی یونیورسٹی کے اینگلو عربک کالج میں بہ حیثیت صدر شعبۂ اُردو میرا تقرر ہو گیا، بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی سرپرستی مجھے نصیب ہوئی اور اس طرح دہلی میں مجھے علمی کام کرنے کے زیادہ مواقع مِلے۔ قیامِ پاکستان تک میں دہلی ہی میں رہا، اور مجھے کالج اور یونیورسٹی میں بڑی عزت مِلی۔

نورالحسن میرے دہلی جانے کے بعد ڈی۔ فل کرنے کے لئے آکسفورڈ چلے گئے۔ تین چار سال وہاں رہے۔ ڈی فِل کر کے واپس آئے تو انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تاریخ کی پروفیسر شپ مِل گئی۔ نواب صاحب رام پور کی صاحب زادی سے اُن کی شادی ہوگئی، اور وہ علی گڑھ میں مستقل طور پر رہنے لگے۔

علی گڑھ کا قیام نورالحسن کے لئے بہت مُفید رہا۔ اُنہوں نے یہاں قابلِ قدر علمی اور تحقیقی کام کیا۔ یونیورسٹی کے لئے بھی وہ بہت مُفید ثابت ہوئے۔ خاص طور پر اس یونیورسٹی میں ترقی پسندانہ رُجحانات کو فروغ دینے میں اُن کے کارنامے بے شمار ہیں۔ اس زمانے میں ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر آل احمد سرور، مجاز، جذبی، اور ڈاکٹر

خورشید الاسلام وغیرہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ترقی پسندانہ رجحانات کے علم بردار تھے۔ نورالحسن نے اُن کے ساتھ مِل کر کام کیا، اور اِن سب کی کوششوں سے ترقی پسندوں کی ایک اچھی خاصی جمعیت علی گڑھ میں فعال نظر آنے لگی۔ اِن کی کوششوں سے جو فضا یونیورسٹی میں قائم ہوئی، اُس نے تقسیم ہند کے بعد یونیورسٹی کو بہت سے خطرات سے محفوظ رکھا۔ اس میں نورالحسن کی کوششوں کا خاصا ہاتھ تھا۔ اِن کوششوں نے اُن اَن گنت طوفانوں کے منہ پھیر دیئے جو مسلم یونیورسٹی کے اندر اور باہر اُمڈ رہے تھے، اور جو علی گڑھ کی روایات کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانے کے درپے تھے۔

نورالحسن اور اُن کے ہم خیال رفقاء کا یہ کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے زمانے میں علی گڑھ میں روشن خیالی اور آزادی کے ساتھ سوچنے کی فضا پیدا کی جس کی بدولت متعصب ہندو ذہنیت کے وہ تمام منصوبے خاک میں مل گئے، جو اُنھوں نے مسلمانوں کی اس عظیم درس گاہ کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے اور اس کی تہذیبی، علمی اور فکری روایات کو ملیامیٹ کرنے کے لئے بنائے تھے۔

نورالحسن خاصے عرصے تک تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ میں رہے۔ وہ بڑی بصیرت والے آدمی تھے۔ اس لئے ہندوستان کی حکومت نے اُنھیں روس میں اپنا سفیر بنایا۔ کئی سال وہاں رہ کر واپس آئے تو اندرا گاندھی کی حکومت میں کئی سال تک وزیرِ تعلیم رہے۔ پھر وہ ہندوستان کے ہسٹاریکل کمیشن کے چیئرمین ہوگئے، اور آج کل وہ ہندوستان کے صوبے مغربی بنگال کے گورنر ہیں جہاں جیوتی باسو کی کمیونسٹ حکومت ہے۔ سنا ہے کہ وہ نہایت ہردل عزیز گورنر ہیں، اور وزیرِ اعلےٰ جیوتی باسو سے اُن کے تعلقات نہایت خوش گوار ہیں۔ اس کا سہرا اُن کی سیاسی بصیرت اور فکری ترفع کے سر ہے۔

تقریباً پچیس تیس سال سے نورالحسن کی منصبی مصروفیات کی وجہ سے میری اُن سے مُلاقات نہ ہوسکی۔ خط وکتابت کا سلسلہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ میں قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آگیا، اور میری منصبی مصروفیات، یعنی شعبۂ اُردو کی صدارت اور اورینٹل کالج

کی پرنسپلی اس راہ میں حائل رہی۔ نورالحسن کی مصروفیات کا علم مجھے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے سے ہوتا رہا۔

چند سال ہوئے ایک دن وہ اچانک لاہور آگئے۔ میں اپنے کالج کے کمرے میں دفتری کام کر رہا تھا کہ ایک صاحب چک اُٹھا کر کمرے میں داخل ہوئے، اور کہا "عبادت! کیا حال ہے؟ میں بغیر اطلاع کے آگیا ہوں۔ تیس سال ہوچکے ہیں۔ تم نے مجھے پہچانا؟"

میں نے کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کیا، اُنہیں گلے لگایا" اور کہا کہ "تمہیں کیسے نہیں پہچانوں گا۔ تم تو میرے دل میں رہتے ہو۔ بھئی خوب آئے۔ بغیر اطلاع کے آئے۔ اس لئے مجھے زیادہ خوشی ہوئی۔ اطلاع دے دیتے تو شاید اتنی خوشی نہ ہوتی۔ تم نے جو Surprise دیا ہے۔ اس کی وجہ سے میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں"۔

یہ کہہ کر میں نے اُنہیں اپنے پاس صوفے پر بٹھایا، اور فرطِ شوق سے باتیں کرنے لگا۔

نورالحسن اب خاصے موٹے ہوگئے تھے۔ لیکن اُن کے اندازِ گفتگو اور لہجے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھٹنوں سے نیچی، کھدر کی شیروانی میں ملبوس تھے۔ لکھنوی انداز کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے، سر پر گاندھی ٹوپی تھی۔ بال بالکل سفید ہوگئے تھے۔ لیکن بھرے بھرے گول چہرے پر سرخی کا وہی عالم تھا جو بچپن اور عنفوانِ شباب میں دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ شان و شکوہ اور وجاہت ایک ایک انداز سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اندازِ دلبری اور طرزِ دل رُبائی کا وہی عالم تھا جس سے وہ بچپن میں پہچانے جاتے تھے۔

میں نے اُنہیں صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا "یار! اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خُدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

سب سے زیادہ خوشی اِس بات کی ہے کہ تم بدلے نہیں ہو۔ ماشاءاللہ تمہاری صحت اچھی ہے، بلکہ کچھ زیادہ ہی اچھی ہوگئی ہے۔ تمہاری وجاہت اور پُرشکوہ کیفیت میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ صحت اور وجاہت کی دولت بیش بہا بہت بڑی نعمت ہے۔"

نُورالحسن کہنے لگے "یہ سب کچھ تُمہارا حُسنِ نظر اور حُسنِ ظن ہے، ورنہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اب بڑھاپا آگیا ہے، اور بیٹھے بیٹھے کام کرنے کی وجہ سے وزن اتنا بڑھ گیا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔"

میں نے کہا "وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی ہے۔ وقت کو کون روک سکتا ہے؟ اُس کے عمل میں کون دخل دے سکتا ہے؟ بچپن جوانی میں اور جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے، سڈول جسم پر فربہی شب خون مارتی ہے، اور انسان کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ تو انسان کا مُقدّر ہے۔"

کہنے لگے "تمہاری بات صحیح ہے۔ لیکن اِس تبدیلی کے ساتھ انسان جذباتی بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی اب زیادہ جذباتی ہوگیا ہوں۔ اور جذبات کی یہی شدّت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے، اور میں اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔"

میں نے کہا "یار! مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس طرح چُپ چپاتے میرے پاس آجاؤ گے۔"

نورالحسن نے کہا "اِس وقت یہاں پہنچنا اور تم سے مِلنا ایک معجزے سے کسی طرح کم نہیں۔ چند گھنٹے پہلے تک یہ خیال بھی نہیں تھا کہ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میں ایک سیمینار میں امرتسر آیا تھا۔ دو دن وہاں رہا۔ سیمینار میں شرکت کی۔ میں دلی سے پاکستان میں ہندوستان کے سفیر مسٹر شرما کے ساتھ امرتسر آیا تھا۔ آج سیمینار ختم ہوا تو انہوں نے لاہور چلنے پر اصرار کیا۔ میں اس خیال سے تیار ہوگیا کہ لاہور میں تم سے مُلاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ اُن کی گاڑی میں صرف ایک گھنٹہ سفر کرکے لاہور آگیا اور سیدھا اورینٹل کالج میں تمہارے پاس پہنچ گیا۔ میرے پاس صرف تین گھنٹے ہیں۔ یہ وقت تمہارے ساتھ

گذاروں گا، چار بجے امرتسر جاؤں گا اور وہاں سے دلّی چلا جاؤں گا"۔

میں نے کہا "تم نے بہت اچھا کیا کہ اس موقع کو غنیمت جان کر لاہور آنے اور مجھ سے ملنے کا پروگرام بنالیا۔ یہ واقعی جذب صادق ہے جو تمہیں یہاں اس طرح کھینچ لایا ہے"۔

کہنے لگے "اس سے قبل بھی کئی دفعہ لاہور آنے کی صورتیں پیدا ہوئیں لیکن میری مصروفیات بیچ میں حائل ہوگئیں، اور میں یہاں نہ پہنچ سکا۔ چند سال وزیر تعلیم کی حیثیت سے کام کیا، اس زمانے میں سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔ پھر چند سال کے لئے ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے روس چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو ہندوستان کے ہسٹاریکل کمیشن کی صدارت مجھے سونپ دی گئی۔ اس کام میں کچھ زیادہ ہی مصروف رہنا پڑا۔ غرض گذشتہ دس بارہ سال ایسے گذرے ہیں کہ مجھے ہوش نہیں رہا"۔

میں نے کہا "جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے۔ مجھے تمہاری مصروفیات کا اندازہ تھا۔ یہ خبریں بھی ملتی رہتی تھیں کہ تم کبھی روس میں ہو، کبھی یورپ کے ممالک میں کبھی امریکہ میں ـــــ چند روز ہوئے میں نے یہ خبر سُنی ہے کہ تم مغربی بنگال کے گورنر ہونے والے ہو"۔

کہنے لگے "ہاں، اس کا امکان تو ہے۔ دیکھو کب تک فیصلہ ہوتا ہے"!

میں نے کہا "تم جب بنگال کے گورنر ہو جاؤ گے تو میں بھی چند روز کے لئے کلکتہ کا پروگرام بناؤں گا۔ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے وہاں میرے کام کی بے شمار چیزیں ہیں۔ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں تو میں کام کر چکا ہوں۔ بہت سی کام کی چیزیں ملی ہیں۔ اب کلکتہ کی لائبریری دیکھنے کی آرزو ہے۔ وہاں بڑا اسامان ہے"۔

کہنے لگے "تمہاری اطلاع صحیح ہے۔ تم ضرور آنا۔ میں تمہارے لئے خاص اہتمام کروں گا۔ اطمینان سے بیٹھ کر وہاں کام کرنا۔ علمی کام کے لئے تمہیں ہر طرح کی سہولت فراہم کی جائے گی"۔

میں نے کہا "دیکھو، کب یہاں سے نکلنے کا موقع ملتا ہے۔ آج کل تو یہاں بڑی

مصروفیت ہے۔ اردو کی پروفیسری کے ساتھ اورینٹل کالج کی پرنسپلی، اورینٹل فیکلٹی کی ڈین شپ، شعبۂ تاریخ ادبیات کی ڈائرکٹر شپ سر اٹھانے کی فرصت نہیں دیتی۔ پھر اپنا بھی علمی اور تحقیقی کام ہے۔ کئی کتابوں پر کام کر رہا ہوں۔ کئی کتابیں اس وقت پریس میں ہیں۔ ذاتی طور پر ان کاموں کی نگرانی ضروری ہے۔ خاصا مصروف رہتا ہوں"۔

نورالحسن نے کہا "تمہاری علمی مصروفیات کا مجھے علم ہوتا رہتا ہے۔ تمہاری کئی کتابیں ہندوستان میں بھی چھپ گئی ہیں۔ مجھے ان کتابوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!"

میں نے کہا "میری کتابیں تو خاصی تعداد میں چھپ گئی ہیں۔ اچھا خاصا کام ہو گیا ہے۔ کچھ کتابیں ہندوستان کے ناشروں نے بھی، میری اجازت کے بغیر وہاں چھاپ لی ہیں۔ لیکن بہت بری طرح چھاپی ہیں۔ پاکستان میں کتابیں خوبصورت چھپتی ہیں۔ ہندوستان میں اردو کی کتابوں کی طباعت معیاری نہیں ہوتی"۔

میں نے لاہور اور کراچی میں چھپی ہوئی اپنی کچھ کتابیں انہیں دیں۔ ان کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ خاص طور پر رائے آنند رام مخلص کی ڈائری مرقعِ مخلص، ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، حیدر بخش حیدری کی گلزارِ دانش، مختصر کہانیاں، دیوانِ حیدری، عبید اللہ خاں مبتلا کے مجموعۂ کلام دیوانِ مبتلا اور خلیل علی خاں اشک کے رسالۂ کائنات، گلزارِ چین، اور بینی نرائن جہاں کے "چار گلشن" اور مظہر علی خاں ولا کی ہفت گلشن، مادھونل کام کندلا اور دیوانِ ولا وغیرہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔

خاص طور پر مرقعِ مخلص، اور گلکرسٹ کی انگریزی نظموں کو دیکھ کر انہوں نے کہا کہ "ان کتابوں میں تو ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ان کتابوں کا اس سے قبل کسی کو علم نہیں تھا۔ تم نے یہ بڑا اہم کام کیا۔ اب ان کو سامنے رکھ کر تاریخ کے پروفیسر ہندوستان اور پاکستان میں خوب کام کریں گے"۔

میں نے کہا "تم تاریخ کے پروفیسر ہو اس لئے ان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہو۔ ان کتابوں کے قلمی نسخے لندن میں میرے ہاتھ آ گئے تھے۔ میں نے ان کو نادر و نایاب چیزیں

سمجھ کر چھاپ دیا۔"

یہ کہہ کر اپنی کتابوں کا سیٹ میں نے اُن کی گاڑی میں رکھوادیا۔

نورالحسن کہنے لگے "لاہور خوب شہر ہے۔ یہاں کے لوگ بھی خوب ہیں، یہاں کا علمی ادبی ماحول بھی ایسا ہے کہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ یہاں کی لائبریریوں میں بیش بہا خزانے محفوظ ہیں۔ خاص طور پر تمہاری پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری تو ایسی ہے کہ اُس کا جواب نہیں۔ اس میں ہزارہا قلمی نسخے ایسے ہیں جو بالکل نادر و نایاب ہیں۔ میں نے ان کی کیٹلاگ کی صرف ایک جلد دیکھی ہے۔ کاش میں اِن کو اطمینان سے بیٹھ کر دیکھ سکتا، اور ان پر کام کر سکتا۔"

میں نے کہا "چلو، یونیورسٹی لائبریری چلتے ہیں۔ کم از کم تم اِن نسخوں کا دیدار تو کرلو۔ جب وقت ملے اور تمہیں فرصت ہو تو تم یہاں آکر ان پر اطمینان سے بیٹھ کر کام بھی کرلینا۔"

یہ کہہ کر میں نے اُنہیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور انہیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لے گیا۔ یونیورسٹی کے لائبریرین رحیم صاحب اور شعبۂ مشرقی کے انچارج جمیل رضوی صاحب سے اُن کا تعارف کروایا۔ پھر انہوں نے قلمی نسخوں کی کیٹلاگ دیکھی، اور کچھ نادر و نایاب قلمی نسخے نکلوائے جن کو وہ تقریباً دو گھنٹے تک دیکھتے رہے، اور اُن کی تاریخی اہمیت مجھے بتاتے رہے۔ اور میں یہ سوچتا رہا کہ اس شخص کو اپنے مضمون سے کتنی دلچسپی ہے۔ یہ واقعی صحیح معنوں میں تاریخ کا پروفیسر ہے۔

دو گھنٹے کے بعد وہ لائبریری سے اُٹھے اور کہنے لگے "میرے پاس وقت نہیں ہے، ورنہ عمر یہیں اسی کام میں بسر کر دیتا۔ اس لائبریری کو دیکھا لیکن تشنگی کا احساس لے کر واپس جارہا ہوں۔ انشاءاللہ فرصت ملی تو پھر کبھی اطمینان سے آؤں گا۔"

ہم لوگ لائبریری سے باہر نکلے تو میں نے کہا "میرے ساتھ کھانا کھالو۔ ابھی وقت ہے۔" کہنے لگے "کھانا تو میں نے امرتسر میں کھالیا تھا۔ حالانکہ وہ کھانا میرے مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ میں تو مسلمانوں کے کھانوں کا دلدادہ ہوں۔ کیا بریانی ہوتی ہے، کیا قورمہ ہوتا ہے، کیا خوب متنجن ہوتا ہے، کیسے عمدہ شیرمال ہوتے ہیں، اور قسم قسم کے کبابوں کا تو جواب نہیں۔ گذشتہ سال میرے بیٹے کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی، ولیمہ کے موقع پر لکھنؤ کے ایک باورچی

نے یہ تمام کھانے بڑی مہارت سے پکائے تھے۔ اِن میں ہندوستان کے مسلمانوں کے کھانوں کا صحیح مزہ تھا۔ لوگوں نے بڑے شوق سے یہ کھانے کھائے اور باورچی کے فن کی خوب خوب داد دی"۔

اور پھر دیر تک وہ اِن کھانوں کی تاریخ بیان کرتے رہے۔ اُن کی معلومات حیرت انگیز تھی۔ میں اُن کی اِن باتوں سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ یوں محسوس ہوا کہ یہ تمام کھانے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ صرف اُن پر دست درازی کرنے کی دیر ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے باہر نکلے تو میں نے کہا "نُورالحسن! تم نے لاہور شہر نہیں دیکھا۔ آؤ موٹر میں بیٹھتے ہیں، اور شہر کی اہم سڑکوں کا ایک چکّر لگا لیتے ہیں تاکہ تمہیں لاہور شہر کے حُسن کا کچھ اندازہ ہو جائے"۔

چنانچہ میں نے مال روڈ، میکلوڈ روڈ اور ایجرٹن روڈ، ڈیوس روڈ، ایمپرس روڈ، کنال بینک اور گلبرگ کی سڑکوں پر موٹر چلانی شروع کی۔ نورالحسن ان سڑکوں، اور بازاروں کی عمارتوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

کہنے لگے "واقعی یہ بہت خوبصورت شہر ہے۔ اس شہر میں رہنے والے لوگ بھی خوبصورت اور طرح دار ہیں۔ واقعی مجھے بہت لُطف آیا۔ تم نے مختصر سے وقت میں شہر لاہور کی جو سیر کرائی ہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں اس حسین و دلآویز شہر اور اس کی مخصوص فضا کو کبھی بھول نہیں سکتا"۔

اب چار بجنے والے تھے، اور نورالحسن کو واپس امرتسر اور وہاں سے دِلّی جانا تھا۔ اس لئے ہم لوگ اورینٹل کالج واپس آئے۔ اُنہیں چائے کی ایک پیالی پلائی، اور پاکستان میں ہندوستان کے سفیر کی اس گاڑی میں بٹھا کر اُنہیں رخصت کیا جو اورینٹل کالج میں اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

چلتے وقت وہ کہنے لگے "آج تمہارے ساتھ جو چند گھنٹے میں نے گذارے ہیں، وہ میرے لئے ایک نہایت ہی حسین اور خوش گوار تجربہ ہے۔ تم سے تیس سال کے بعد مُلاقات ہوئی، تمہارے کالج کو دیکھا۔ تمہاری یونیورسٹی کو دیکھا، تمہاری یونیورسٹی کی لائبریری کو دیکھا،

تمہاری کتابوں کی زیارت کی، تمہارے شہر کا دیدار کیا۔ ان سب کی حسین یادوں کا ایک بیش بہا خزانہ میں اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم وقت نکال کر مجھ سے ملنے کے لئے امرتسر سے لاہور آئے۔ تم سے مل کر بچپن اور جوانی کی بے شمار یادیں تازہ ہوئیں۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ چند گھنٹوں ہی کے لئے سہی لاہور آئے تو، اور پورا ایک دن میرے ساتھ گذارا۔ میرے لئے تو یہ وقت 'غیرتِ یوسف' ہے۔ ہم نے اس کو رائیگاں نہیں جانے دیا۔ میر صاحب کا شعر یاد آگیا ؎

غیرتِ یوسف ہے یہ وقت عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

اِن جذباتی باتوں کے ہجوم میں میں نے نور الحسن کو لاہور سے رخصت کیا اور اُن کے جانے کے بعد دیر تک میری آنکھوں میں ستارے سے جھلملاتے رہے!

مرزا منّان اللہ بیگ

لکھنؤ یونیورسٹی میں یوں تو ہمارے کئی ساتھی ایسے تھے جنہوں نے اپنے مخصوص شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں سید آغا حسن عابدی، غوث محمدؐ خاں ملیح آبادی، حبیب الرحمٰن، ولی کمال خاں، باقر حسنین رضوی اور منان اللہ بیگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آغا حسن نے بینکنگ کی دُنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ غوث محمدؐ خاں ٹینس کے نامور کھلاڑی تھے اور کئی سال تک حسین کامل قدوائی ہندوستان کے نمبر ایک کھلاڑی رہے۔ حبیب الرحمٰن نامور صحافی اور ادیب تھے۔ ولی کمال خاں اُردو ادب کے سنجیدہ طالب علم تھے، باقر حسنین رضوی اعلےٰ درجے کے شاعر تھے، اور منان اللہ بیگ مجلسی آدمی ہونے کی وجہ سے نہایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ کشتی رانی اور کئی دوسرے کھیلوں میں ماہر تھے، اور شعر وادب سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں وہ فوج میں چلے گئے اور اعلےٰ عہدوں پر پہنچے۔ لیکن ہمیشہ شعر وادب سے دلچسپی لیتے رہے۔

منان بی۔ اے میں میرے کلاس فیلو تھے۔ ام۔ اے انہوں نے انگریزی ادبیات میں کیا۔ اُس زمانے میں مسلمانوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ملازمت مشکل سے ملتی تھی۔ اگر وہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں ہوتے تو بلند پایہ ادیب اور اسکالر ہوتے۔ مجبوراً انہیں فوج میں ملازمت کرنی پڑی۔ لیکن اس ملازمت میں بھی انہوں نے اپنے ادبی ذوق کی شمع کو فروزاں

رکھا، اور مطالعے میں اپنا زیادہ وقت گذارتے رہے۔

میں جب یونیورسٹی میں داخل ہوا تو اُن سے میری مُلاقات ہوئی۔ اچھے آدمی معلوم ہوئے۔ اس لئے جلد ہی اُن سے دوستی ہوگئی، اور وقت کے ساتھ ساتھ خاصی گاڑھی چھننے لگی۔

منان جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ دراز قد، دُبلے پتلے، گندمی رنگ، علی گڑھ کٹ کے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس، ہر وقت شگفتہ و شاداب، مہذب اور شائستہ، خوش اخلاق اور خوش گفتار، مخلص اور ملنسار، یہ تھے مرزا منان اللہ بیگ! خاص لکھنؤ کے رہنے والے اور اس سرزمین مینو سواد کی تہذیب و شائستگی کے علم بردار، اُن میں وہ تمام خصوصیات تھیں جن سے لکھنؤ والے پہچانے جاتے ہیں۔

اُن کا آبائی مکان امین آباد میں تھا جو ایک بارونق جگہ تھی۔ اُن کی جائے قیام پر کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کا مکان شہر کی مرکزی جگہ پر تھا۔ ایسا کچھ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ لیکن صاف ستھرا، جاذبِ نظر اور آرام دہ ہونے کی وجہ سے اُس میں دل لگتا تھا۔ کیونکہ اُس میں منان صاحب کی محفلیں جمتی تھیں، اور وہ اِن محفلوں میں چہکتے تھے۔ قسم قسم کے کھانے یہاں تیار ہوتے تھے۔ بازار سے بھی خاص خاص چیزیں منگوائی جاتی تھیں، اور اُن سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔

اس زمانے میں منان کی دلچسپیاں بھی خاص لکھنؤ والوں کی سی تھیں۔ طرح طرح کے کبوتر اُنھوں نے پال رکھے تھے۔ کچھ اُڑنے والے، کچھ صرف دیکھنے کے لئے مثلاً شیرازی اور لقا وغیرہ۔ اِن کے علاوہ لال طوطے اور قسم قسم کی چڑیاں جو ہر وقت چہچہاتی رہتی تھیں۔ منان صاحب ان سب سے جی بھر کے لُطف اندوز ہوتے تھے۔ اِن چیزوں سے اُن کا شوق اور جذب فراواں دیدنی تھا۔ اس ماحول میں منان صاحب پڑھتے لکھتے بھی تھے اور احباب کے ساتھ تاش، کیرم، پچیسی اور نہ جانے کیا کیا کچھ کھیلتے تھے۔ گھوڑوں سے بھی انہیں دلچسپی تھی، کُتوں سے بھی شغف تھا، اور اُن کی نسلوں پر بھی دلچسپ باتیں ہوتی تھیں۔ منان اچھے خاصے کھلنڈرے تھے۔

لیکن اس ماحول کے باوجود منان کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی تھی۔ بلا کے ذہین اور

محنتی تھے، اور اُن کا ادب کا ذوق نہایت نکھرا ہوا تھا۔ انگریزی ادب اور اُردو ادب دونوں سے انہیں دلچسپی تھی۔ قدیم ادب اور جدید ادب دونوں کا مطالعہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا، اور وہ ادب کے نہایت سنجیدہ طالب علم تھے۔ اُنھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ام۔ اے کیا، اور چار سال جو انھوں نے یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے گذارے، اُس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، اور وہ ادبیات کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ زندگی بھر اس سے وابستہ رہے۔

اُس زمانے میں مسلمانوں کو معقول ملازمت ذرا مشکل سے ملتی تھی۔ اس لئے وہ تعلیم سے فارغ ہو کر فوج میں چلے گئے۔ اُنہیں اس زمانے میں آسانی سے کمیشن مل گیا، اور اُنھوں نے تقریباً پچیس سال اس ملازمت میں گذارے۔ جنگ کے دوران اُنھوں نے ملک کے باہر بھی فوجی خدمات انجام دیں، جس نے انہیں ایک تجربہ کار فوجی افسر بنا دیا۔ اس ملازمت کی بہ دولت اُن کے مزاج میں باقاعدگی آگئی، فرض کا احساس بھی خاصا پیدا ہو گیا، لیکن شعر و ادب کا جو چسکا انہیں بچپن سے تھا، اُس میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ فوجی ملازمت میں بھی وہ ادب کا مطالعہ ذوق و شوق سے کرتے رہے۔ انھوں نے لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی لیکن ادب کے مطالعے کو ایک فن کی طرح جاری رکھا۔ وہ ادبی مسائل پر ہمیشہ بڑی دلچسپ اور خیال انگیز باتیں کرتے تھے۔ اُن کی اِن باتوں میں بڑی بصیرت کا احساس ہوتا تھا اور اُن کے خیالات میں علم و آگہی کی قندیلیں سی روشن نظر آتی تھیں۔

فوج میں جانے کے تین چار سال بعد جب وہ وطن واپس آئے تو اُن کی شادی ہوگئی، اور قدرت نے اُنہیں ایسی رفیق حیات سے نوازا جو خود نہایت مخلص، سلیقہ شعار، شائستہ مہذب اور باذوق تھیں۔ اُنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی، اور اُن کا تعلق وہاں کے ایک مشہور و معروف خاندان سے تھا۔ وہ منان اور اُن کے دوستوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مہمان نوازی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ منان کے ساتھ وہ تقریباً چالیس پنتالیس سال گذار چکی ہیں۔ اُنھوں نے منان کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اور اُنہیں کی بدولت اُن کا کھلنڈرا پن خاصی حد تک کم ہوا۔ ہیرا جب تک تراشا نہ جائے، وہ حُسن و جمال اور قدر و قیمت سے

آشنا نہیں ہوتا۔ بیگم منان نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ یوں تو منان ہمیشہ سے اچھے انسان تھے لیکن بیگم کی دیرینہ رفاقت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اُنہیں کُندن بنا دیا۔

منان شادی سے قبل، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا، ایک کھلنڈرے قسم کے نوجوان تھے۔ پڑھنے لکھنے میں تو خاصے تیز تھے لیکن لکھنؤ کے مخصوص ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے کبوتر اُڑانے، پتنگ بازی کرنے، گھوڑے دوڑانے، کشتی چلانے، انواع واقسام کے پرندے، جانور پالنے اور زندگی سے رس نچوڑنے کے کاروبار میں بھی کسی لکھنوی سے کم نہیں تھے۔ شادی کے بعد اُن کے ہاں اِن معاملات میں خاصی حد تک توازن پیدا ہوا، اور وہ شعروادب سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگے۔ یہاں تک کہ تقریباً نصف صدی تک اس دور کے اہم شاعروں اور ادیبوں سے اُن کی دوستی رہی، اور اِس دُنیا میں اُنہوں نے اِن لوگوں کے ساتھ مِل کر خاصے ہنگامے برپا کئے۔ اُن کا ادبی ذوق نہایت سُتھرا تھا۔ اب اس میں کچھ اور بھی نکھار آگیا۔

میں اُس زمانے میں منان کے ہاں اکثر جاتا تھا، اور اَن سے اور اُن کی بیگم سے مِل کر مجھے بے حد مسرت ہوتی تھی۔ احباب اُن کے ہاں جمع ہوتے تھے۔ شعروشاعری کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ ادبی معاملات ومسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ اعلےٰ درجے کے شاعروں کا کلام ترنم سے پڑھا جاتا تھا۔ موسیقی کی محفلیں بھی منعقد کی جاتی تھیں، دلچسپ گفتگو بھی ہوتی تھی۔ لطیفے بھی سنائے جاتے تھے۔ کھانے کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ منان کا دسترخوان ہمیشہ سے وسیع تھا، بیگم نے اس میں کچھ اور بھی وسعتیں پیدا کر دی تھیں۔ گھر میں انواع واقسام کے کھانے تیار ہوتے تھے۔ بازار سے بھی کھانے کی خاص خاص چیزیں منگوائی جاتی تھیں، مثلاً ٹنڈے اور غلام حُسین کے پُل والے کبابی کے کباب، قبروالی دوکان کی پوریاں اور کچوریاں، نظیرآباد کے مشہور حلوائی عبداللہ کے ہاں کی مٹھائیاں، لکھنؤ کی خاص بالائی اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ احباب کی اِن تمام چیزوں سے تواضع کی جاتی تھی۔ میں بھی اِن محفلوں میں شریک ہوتا تھا اور منان اور اُن بیگم کی مہمان نوازی اور سلیقہ شعاری کی

داد دیتا تھا۔

لیکن لکھنؤ کی یہ محفلیں جلد ہی درہم برہم ہو گئیں، کیونکہ چند سال ہی گذرے تھے کہ قیام پاکستان عمل میں آ گیا۔ منان کی ملازمت فوج میں تھی، اس لئے انہوں نے پاکستانی فوج میں خدمات انجام دینے کا فیصلہ کیا، اور وہ جلد ہی ایک فوجی اسپیشل میں لکھنؤ سے راول پنڈی روانہ ہو گئے۔ وہ دن مجھے اب تک یاد ہے جب لکھنؤ کے چارباغ اسٹیشن پر ہم سب جمع ہوئے، اور ہم نے انہیں رخصت کیا۔ منان فوجی وردی میں ملبوس تھے اور خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے سائے میں ہم سے رخصت ہو رہے تھے۔ دوسرے دن وہ اس فوجی اسپیشل میں پاکستان پہنچ گئے، اور راول پنڈی سے ان کا خط آیا جس میں یہ اطلاع تھی کہ جنرل ہیڈ کوارٹر میں ان کی پوسٹنگ ہو گئی ہے، اور وہ وہاں خوش و خرم ہیں۔

میں بھی قیام پاکستان کے بعد دلی سے لاہور پہنچا، اور اورینٹل کالج میں تدریس و تحقیق کا کام شروع کر دیا۔ اس زمانے میں کبھی میں راول پنڈی جاتا، کبھی منان لاہور آتے، اور اس طرح ان سے طویل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پنڈی پہنچنے کے بعد انہیں لال کرتی میں ماموں جی روڈ پر رہنے کے لئے مکان مل گیا تھا، اور اس میں وہ اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے تھے۔

دیکھتے دیکھتے ان کا یہ مکان ادیبوں اور شاعروں کا ایک مرکز بن گیا۔ راول پنڈی میں اس وقت جو لکھنے والے تھے وہ سب یہاں آتے تھے۔ ان میں حفیظ جالندھری، سید محمد جعفری، فضل احمد کریم فضلی، شوکت تھانوی، مختار صدیقی، یوسف ظفر، باقی صدیقی، شفیق الرحمٰن، ملک نسیم الظفر اور راز مرادآبادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کراچی سے جمیل الدین عالی، ظریف جبل پوری، ادیب سہارن پوری، تابش اجمیری وغیرہ بھی اکثر یہاں آتے تھے۔ جگر صاحب کا قیام بھی اس مکان میں مہینوں رہتا تھا۔ ان سب کی وجہ سے معیاری ادبی محفلیں یہاں منعقد ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں شعر و شاعری ہوتی تھی مقالات اور افسانے پڑھے جاتے تھے، اور ان پر تنقیدی بحث بھی ہوتی تھی۔

لاہور سے میں بھی ان محفلوں میں شریک ہونے کے لئے اکثر راول پنڈی پہنچ جاتا

تھا اور کئی کئی دن وہاں رہتا تھا۔ منان اللہ بیگ اِن محفلوں میں میزبانی کے فرائض انجام دیتے تھے، اور سب کی تفریح طبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔ شعروشاعری ہوتی تھی دعوتیں ہوتی تھیں۔ پکنک منائے جاتے تھے۔ غرض منان کی ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے سب کا وقت اُن کے ہاں بہت اچھا گذرتا تھا، اور خوب رونق رہتی تھی۔

منان اللہ بیگ بڑے ہی مہمان نواز آدمی ہیں۔ اُن کے ہاں کوئی مہمان آجائے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ ہر طرح سے اُس کا خاص خیال رکھتے ہیں، اور وہ اُن کے ہاں اپنے گھر کی طرح رہتا ہے۔ جگر صاحب اُس زمانے میں تقریباً سارا سال پاکستان میں گذارتے تھے۔ پنڈی میں اُن کا قیام زیادہ تر منان کے ہاں رہتا تھا، اور وہ کئی کئی مہینے اُن کے ساتھ وقت گذارتے تھے۔ جگر صاحب رمی کھیلنے کے بہت شوقین تھے۔ دن دن بھر اور رات رات بھر رمی کھیلتے تھے، اور منان ان کو خوش رکھنے کے لئے ہمیشہ اُن کا ساتھ دیتے تھے۔ منان دفتر چلے جاتے تھے تو منان کی بیگم اور بچے جگر صاحب کے ساتھ رمی کے کھیل میں شریک ہوکر اُن کا دِل بہلاتے تھے۔ غرض جگر صاحب کا منان کے ہاں بہت خیال رکھا جاتا تھا، اور جگر صاحب اُن کے ہاں بہت خوش رہتے تھے۔

بات یہ ہے کہ منان بڑے ہی جذب وکشش کے مالک ہیں۔ وہ نہایت مخلص اور شائستہ انسان ہیں ہر ایک سے نہایت محبت سے مِلتے ہیں۔ اُن کی باتوں میں گلوں کی سی خوشبو اور اُن کے لہجے میں شہد وشکر کی سی شیرینی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اس لیے جو شخص بھی اُن سے مِلتا ہے وہ اُن کا گرویدہ اور والا وشیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کا گھر بے تکلفی اور آزادی کی فضا سے پہچانا جاتا ہے۔ اِسی لئے ادیب اور شاعر تک، جو حد درجہ حساس ہوتے ہیں، اُن کے پاس بے تکلفی سے آتے ہیں، اور اُن کے ساتھ اچھا وقت گذارتے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو، جو آسانی سے ہاتھ نہیں آتے، اُن کے ہاں بے تکلفی سے قیام کرتے ہوئے دیکھا۔ منان اُن کی ایسی خاطر و مدارت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے گھروں سے بھی زیادہ آرام مِلتا ہے۔

منان کبھی کبھی لاہور آتے ہیں اور میرے پاس ٹھہرتے ہیں۔ بے تکلفی سے میرے

ساتھ وقت گذارتے ہیں۔ کھانے کے شوقین ہیں۔ اس لئے جس چیز کو جی چاہتا ہے بے تکلفی سے اس کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے اس ذوق و شوق کا ہمارے ہاں خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔

چند سال ہوئے وہ میرے ہاں آئے۔ چند روز قیام کیا۔ قسم قسم کے مُرغن کھانے کھا کھا کر تنگ آگئے تو ایک دن مجھ سے کہنے لگے "آج تو میں صرف آلو کا سالن اور تندوری روٹی کھاؤں گا۔ اس کے ساتھ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں"۔

میں نے کہا "یہ تو بہت آسان کام ہے۔ آج دن میں ہم لوگ یہی کھانا کھائیں گے"۔ چنانچہ اس کا اہتمام کیا گیا۔

منان نے خالص گھی میں پکا ہوا آلو کا سالن تندوری روٹی کے ساتھ بڑے شوق سے کھایا، اور تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ مزے لے لے کر شوق سے کھانا کھاتے رہے اور بکرے کے گوشت، نئے آلو اور ہرا دھنیا پڑے ہوئے شوربے کی اور تندوری روٹی کے سوندھے پن کی ایسی تعریف کی کہ مجھے بھی اس کھانے میں مزہ آنے لگا۔

منان کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور نکھرا ہوا ہے، اور اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ادب اور کلچر کے مختلف پہلوؤں پر وہ ایسی دلچسپ باتیں کرتے ہیں جو ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں اُتر جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تقریباً تمام ادیبوں اور شاعروں سے اُن کا رابطہ ہے، اور وہ سب کے سب انہیں اپنا عزیز دوست سمجھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ منان اپنی اَن گنت مصروفیات کی وجہ سے تخلیق ادب کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکے۔ حالانکہ اُن میں تخلیق ادب کی بڑی صلاحیت تھی۔ اُن کے جو بے شمار خطوط میرے پاس ہیں اُن میں خاصا ادبی رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے۔ ایک تازہ خط سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ خط جلدی میں صرف کتابوں کی رسید کے طور پر لکھا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"عبادت میری جان! جُگ جُگ جیو!

کل کتابیں ملیں۔ دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا۔ ابھی تو ایک سرسری نظر ہی ڈالی تھی کہ

جذبات بے قابو ہوگئے۔

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

ہائے ہائے! وہ لکھنؤ، اور وہ ہماری جوانی کا زمانہ!

تمہاری "یادِ عہد رفتہ" تو لگتا ہے میری ہی داستان ہے۔ تھوڑی تھوڑی روز پڑھوں گا۔ چاہتا ہوں کہ کبھی ختم نہ ہو!

باقی تینوں کتابیں بھی میرے لئے ایک خزانہ ہیں۔

خط تو بھیج چکا ہوں۔ یہ تو کتابوں کی رسید ہے، مع اپنے دل کی گہرائیوں کی محبت کے ساتھ۔

تمہارا

منّان

اس مختصر سے خط میں وہ سب کچھ موجود ہے جس سے تخلیقی ادب پہچانا جاتا ہے۔

کاش منّان لکھنے کی طرف توجہ کرتے!

اگر ایسا ہوتا تو اردو ادب ایک اعلےٰ درجے کے ادیب سے محروم نہ رہتا۔

منان جہاں گشت آدمی ہیں۔ ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں گھومے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے جب کبھی لہر آتی ہے تو انگلستان، امریکہ، جرمنی، فرانس اور خدا جانے کہاں کہاں اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ چلے جاتے ہیں، اور اِن ممالک کی سیر سے جی بھر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

زندگی کو بسر کرنا اور لطف اندوز ہونا کوئی منان سے سیکھے!

منان اللہ بیگ طبعاً رومانی ہیں۔ خیالوں کی دنیا میں بسیرا کرتے ہیں۔ خواب دیکھتے ہیں۔ زندگی کے حسن و جمال کے شیدائی ہیں، اور یہ حسن و جمال انہیں صرف انسانوں ہی میں نہیں، کائنات کی ہر چیز میں نظر آتا ہے۔ مناظر فطرت، تہذیب اور کلچر، شعر و ادب اور انسانی رشتوں میں حسن و جمال کی دنیائیں آباد دیکھتے ہیں۔ اسی لئے انسانی زندگی کے تمام مظاہر سے انہیں گہری دلچسپی ہے، اور اُن کی زندگی اسی دلچسپی سے عبارت ہے۔ وہ زندگی کے ان گنت مظاہر سے رس نچوڑتے ہیں، اور جب وقت کے ساتھ ساتھ یہ مظاہر

ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں، تو وہ اِن کی بے شمار یادوں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ درد اور کسک کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہیں، اور بالآخر اُداس ہو جاتے ہیں۔

وہ ایک مثالی معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کی کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتے۔ اسی لئے ہر وقت زندگی اور زمانے کے شکوہ سنج رہتے ہیں۔ خاص طور پر وطن عزیز اور اپنے معاشرے کی زبوں حالی کا شکوہ وہ اکثر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ محب وطن اور خیر کی قدروں کے علم بردار ہیں۔ اُکھڑے اُکھڑے رہنا ایسے شخص کا مقدر ہوتا ہے۔ منان بھی ہمیشہ اُکھڑے اُکھڑے سے رہتے ہیں۔ جم کر کوئی کام نہیں کرتے۔ لیکن اس کے باوجود دُھن کے پورے اور کام کے پکّے ہیں۔

اگر وہ فوج میں رہتے تو یقیناً اس وقت لیفٹیننٹ جنرل یا جنرل کے عہدے پر ضرور فائز ہوتے لیکن حد درجہ حسّاس اور جذباتی ہونے کی وجہ سے اُنہوں نے فوج کی ملازمت سے قبل از وقت استعفیٰ دے دیا۔ اپنے ایک رفیق کار کے غیر انسانی روّیے سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور فوج کی ملازمت چھوڑ دی۔ کچھ عرصے پریشان بھی رہے لیکن پھر کاروبار شروع کر دیا، اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کاروبار کو آسمان کی بلندیوں سے ہم کنار کر دیا۔ بڑی جدوجہد کی، اور اپنی خداداد ذہانت، اَن تھک محنت اور جفاکشی کی بدولت ایسی کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار ہوئے جو ہر ایک کے لئے قابلِ رشک ہے۔

میں نے منان کے ساتھ خاصا وقت گذارا ہے، اور جو لمحے اُن کے ساتھ گذارے ہیں وہ میری زندگی کے بہترین لمحے ہیں۔ وہ پیار اور محبت کے آدمی ہیں، اخلاص کا پیکر ہیں۔ ایسا انسان نہ صرف اپنی زندگی کو بلکہ دوسروں کی زندگی کو بھی فردوس ارضی کا نمونہ بنا دیتا ہے۔

اور منان اپنی شخصیت کی اسی خصوصیت سے پہچانے جاتے ہیں!

پروفیسر مرزا محمود بیگ

یہ جنوری ۴۷ئہ کے آخری دن تھے۔

میں صبح کے وقت اینگلو عربک کالج میں صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے لکھنؤ سے دِلّی پہنچا، اور اینگلو عربک کالج ہوسٹل کے اُس بلاک میں قیام کیا جو اساتذہ کے لئے مخصوص تھا۔ دن تو کالج کے کاموں میں گذر گیا۔

شام ہوئی تو میرے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں باہر نکلا تو ایک صاحب برآمدے میں کھڑے ہوئے نظر آئے۔ بھاری بھرکم جسم، سُرخ سفید رنگ، سر پر گھونگر والے بال، نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس، شگفتگی اور شادابی اُن کے ایک ایک انداز میں جھلکتی ہوئی اور مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی نظر آئی۔

مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے "عبادت صاحب! السلام علیکم

میں نے کہا "وعلیکم السلام" "مزاج شریف!"

اور میں اُنہیں دیکھ کر سوالیہ نشان بن گیا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ لیکن اُنہوں نے میرے انداز سے یہ معلوم کر لیا کہ میں ان کے لئے اور وہ میرے لئے اجنبی ہیں۔

کہنے لگے "میرا نام مرزا محمود بیگ ہے۔ میں اس کالج میں فلسفہ اور نفسیات پڑھاتا ہوں۔ اس ہوسٹل کا وارڈن بھی ہوں۔ آپ کے آنے کی اطلاع مجھے مِل گئی تھی۔ یہ بھی معلوم

ہوا تھا کہ آپ یہیں ٹھہریں گے۔ میں نے آپ کے لئے کمرہ ٹھیک کروا دیا تھا۔ میں آپ کے قریب ہی وارڈن کے سرکاری مکان میں رہتا ہوں۔ سوچا کہ شام کو آپ فارغ ہوں گے۔ آپ کی خیریت معلوم کر لوں، اور آپ سے یہ پوچھ لوں کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ آپ یہاں آرام سے تو ہیں؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا "مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ آج کل دلّی میں سر چھپانے کی جگہ کا مل جانا بہت بڑی بات ہے۔ آپ نے اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں اساتذہ کے لئے ایک بلاک مخصوص کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے خاصی تعداد میں کالج کے اساتذہ آرام سے رہتے ہیں، اور پھر اُنہیں ہوسٹل سے کھانا اور ناشتہ بھی مل جاتا ہے۔ یہ سب سے بڑی سہولت ہے"۔

بیگ صاحب نے کہا "دلی میں آج کل رہنے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ اس شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہاں مکان کا ہے۔ باہر سے بے شمار لوگ دلّی میں آ گئے ہیں۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ ہوسٹل کا ایک حصّہ اساتذہ کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ اس بلاک کے کمروں کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے۔ ان میں مرحوم دہلی کالج کے زمانے میں حالی، نذیر احمدؐ اور مولانا محمد حسین آزاد بھی رہ چکے ہیں اور اب آپ لوگوں کا قیام انہیں کمروں میں ہے۔ آپ میری طرح اکیلے آدمی ہیں۔ اطمینان سے یہاں وقت گذاریئے۔ پڑھایئے اور لکھنے پڑھنے کا کام کیجئے۔ کبھی کوئی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے میرے پاس آیئے۔ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں"۔

کھڑے کھڑے یہ باتیں کر کے بیگ صاحب رُخصت ہوئے، اور اُن کے جانے کے بعد میں یہ سوچتا رہا کہ اس شخص کی شخصیت میں کتنی جاذبیت ہے! یہ کس قدر مہذب، شائستہ، اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ اس کا اخلاق کتنا بلند ہے۔ اس کے لہجے میں کتنی شیرینی، اور اس کی باتوں میں کتنا رس ہے! اس سے تو دوستی کی جا سکتی ہے۔ یہ تو محبت کرنے کے قابل ہے۔

دن گذرتے گئے، اور پھر بیگ صاحب سے تقریباً روزانہ ملاقات ہونے لگی۔ وارڈن

کے سرکاری مکان کا ایک دروازہ ہوسٹل کے اس بلاک کی طرف تھا جس میں اساتذہ رہتے تھے اس لئے بیگ صاحب سہ پہر کو عموماً اس دروازے کو کھولتے اور ہمارے پاس آجاتے تھے۔ چائے پیتے تھے، اور دیر تک باتیں کر کے گل و گلزار کھلاتے تھے۔

بیگ صاحب کی عمر اس وقت چالیس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ابھی تک اُنہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ تنہا وارڈن کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ دِلی والے تھے۔ اُن کا آبائی مکان فراش خانے کے قریب دِلی کے محلے رودگراں میں تھا۔ یہاں اُن کے والدین اور دوسرے عزیز و اقارب رہتے تھے۔ یہ محلہ اینگلو عربک کالج سے ایسا کچھ دور نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین اور عزیزوں سے مِلنے کے لئے روزانہ رودگراں جاتے تھے لیکن مُستقل طور پر اُن کا قیام کالج میں تھا۔ یہاں وہ اپنے ایک ملازم سعد اللہ کے ساتھ رہتے تھے۔ سعد اللہ اُن کے مکان کی دیکھ بھال کرتا تھا، اور اُن کے لئے کھانا بھی پکا دیتا تھا۔ مکان کے نیچے کھُلے ہوئے گیراج میں اُن کی کار کھڑی رہتی تھی۔ بیگ صاحب جب ام۔ اے کی جماعتوں کو لیکچر دینے کے لئے یونیورسٹی جاتے تھے تو اس کار کو نکالتے تھے۔ سعد اللہ کو بھی موٹر کار کو چلانے کی اجازت تھی۔ سعد اللہ، بیگ صاحب کے ساتھ شہزادوں کی طرح رہتا تھا۔ ہر وقت سوٹ پہنے رہتا تھا۔ بیگ صاحب اس کو اپنے بیٹوں کی طرح رکھتے تھے۔ لوگوں کو اُس پر رشک آتا تھا، اور وہ کہتے تھے کہ بیگ صاحب نے اس لڑکے کا دماغ خراب کر دیا ہے اس کو نوکروں کی طرح نہیں رکھتے۔ انہوں نے تو اس کو گھر کا مالک بنا دیا ہے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کسی کی پروا نہیں کرتا۔"

یہ باتیں جب بیگ صاحب تک پہنچتیں تو وہ سنی کو ان سُنی کر دیتے۔ بات یہ ہے کہ وہ نوکروں کو کم مرتبہ نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ نوکر بھی انسان ہوتے ہیں۔ مالک کی خدمت کرتے ہیں۔ اس لئے انہیں گھر کا فرد سمجھنا چاہیئے اور اُن کے لئے وہ تمام سہولتیں فراہم ہونی چاہئیں جو گھر کے لوگوں کے لئے فراہم کی جاتی ہیں۔ بیگ صاحب اس پر عمل کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی بیگ صاحب کے ساتھ کام کرتا تھا، اس کو وہ بادشاہ بنا دیتے تھے۔ اور اسی وجہ سے اُن کے ماتحتوں کے ہاں ایک عجب طرح کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی

تھی، اور وہ اپنے آپ کو کسی سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔

دراصل بات یہ ہے کہ بیگ صاحب بڑے ہی انسان دوست آدمی تھے۔ احترام آدمی اُن کا نصب العین تھا، اور وہ انسان کے لئے عزّت نفس کو ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کے خیال میں طبقاتی تفریق انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے وہ طبقاتی معاشرے میں رہنے کے باوجود، اپنے فکر و عمل سے اس کو ختم کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے نے اُن کے ہاں اِن خیالات کو پیدا کیا تھا، اور اِن خیالات ہی کی بدولت وہ ایک ایسے انسان بن گئے تھے جو طبقاتی معاشرے میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔

بیگ صاحب انسان کی عزّت کرتے تھے۔ اس کو پامال وزبوں حال نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کے دُکھ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کی زندگی کا مقصد لوگوں کی زندگیوں کو سنوارنا اور نکھارنا تھا۔ کسی کو کوئی تکلیف ہو تو وہ اس کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے تھے، اور جس طرح بھی ممکن ہوتا تھا، اُس کی مدد کرتے تھے۔ وہ کبھی کسی کی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اُس کو کبھی ڈانٹتے پھٹکارتے نہیں تھے۔ دشمنوں تک سے اُن کا یہی رویّہ تھا۔ لیکن اُن کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ وہ انسان کو مجبور محض اور اپنے معاشرے اور ماحول کی پیداوار سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی غیر متوازن رویّہ اختیار کرتا تھا تو اس کو بھی معاف کر دیتے تھے۔ بلکہ اس کو متوازن اور نارمل بنانے کی اپنی سی پوری کوشش کرتے تھے۔ کسی سے نفرت کرنا انہیں نہیں آتا تھا۔ محبت کرنا اُن کا نصب العین تھا اور اس محبت سے وہ لوگوں کے دلوں کو جیت لیتے تھے۔ ہر شخص اُن کا عاشق تھا، لوگ اُن کی پرستش کرتے تھے اس لئے کہ اُن کی شخصیت میں وہ خصوصیات تھیں جو دیوتاؤں، صوفیوں اور اللہ والوں میں ہوتی ہیں۔

وہ اینگلو عربک کالج میں نفسیات کے پروفیسر تھے۔ نفسیات اور فلسفے کے علوم پر انہیں عبور حاصل تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے اور پڑھانے لکھانے میں گذارتے تھے۔ علم کے خزانے، جو اُن کے سینے میں محفوظ تھے، اُن کو طالب علموں کے سینوں میں اُتارنے

کافن اُنہیں خوب آتا تھا۔ بات ایسے دلنشین انداز میں کرتے تھے کہ وہ دلوں میں اُتر جاتی تھی۔ طالب علم اُن کے لیکچروں میں مسحور ہو جاتے تھے۔ اُنھوں نے ہزارہا طالب علموں کو علم کی دولت بیش بہا سے مالا مال کیا اور ساتھ ہی اُن کی تربیت بھی ایسی کی کہ انہیں صحیح معنوں میں مثالی انسان بنا دیا۔ اُن کے طالب علم اپنی انسانیت، انسان دوستی، تہذیب، شائستگی اور بلند اخلاقی سے پہچانے جاتے تھے۔

کالج اور یونیورسٹی میں ایم۔ اے اور بی۔ اے آنرز کے طالب علموں کو وہ ٹائم ٹیبل کے مطابق لیکچر تو دیتے ہی تھے۔ اُنہیں گھر پر بھی آنے کی بھی اجازت تھی۔ گھر پر بھی وہ انہیں نہ صرف پڑھاتے تھے بلکہ اُن کی تربیت کا کام بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دو چار سال جو طالب علم اُن کے ساتھ رہتا تھا، اُس کی دُنیا ہی بدل جاتی تھی، اور وہ ایک مکمل انسان بن جاتا تھا۔

اُن کی شخصیت ایک چشمۂ شیریں تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں مردم و مرغ و مور کی طرح اُن کے آس پاس اور گرد و پیش اس طرح رہتے تھے جیسے بیگ صاحب اُن کی زندگی کا محور ہوں۔ اُن کی پدرانہ شفقت ایسی تھی کہ کسی طالب علم کو ان کے ساتھ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اُن کے معلّم بھی تھے، دوست بھی تھے اور ایک شفیق باپ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم اپنے علمی اور تعلیمی معاملات و مسائل کے ساتھ اپنے ذاتی مسائل بھی اُن کے سامنے پیش کرتے تھے، اور بیگ صاحب کے مفید مشوروں سے اُن کے ان معاملات و مسائل کا ایسا حل نکل آتا تھا جس سے وہ مطمئن ہو جاتے تھے، اور اس طرح اُنہیں ایک عجیب طرح کا سکون قلب محسوس ہوتا تھا۔

میں کئی مہینے تک بیگ صاحب کے اِن معمولات کو دیکھتا رہا۔ بالآخر میں نے ایک دن اُن سے پوچھا۔

"آپ کے طالب علم ہر وقت آپ کے پاس آتے رہتے ہیں۔ آپ ان کے لئے اتنا وقت کیسے نکالتے ہیں؟"

کہنے لگے "عبادت صاحب! میری زندگی طالب علموں کے لئے وقف ہے۔ میں انہیں اپنے بچّوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اکیلا آدمی ہوں۔ بیوی بچّوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہوں۔ وقت میرے پاس خاصا ہوتا ہے۔ میں اِن طالب علموں سے محبت کرتا ہوں، اور اُن کے مسائل کو سمجھنا اور اُن کو حل کرنا، ایک اُستاد کی حیثیت سے میرا فرض ہے۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ یہ سب کچھ میں شوق سے کرتا ہوں۔ اس طرح میرا وقت بھی اچھا گذر جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے مجھے ایک عجب طرح کی طمانیت نصیب ہوتی ہے"۔

میں نے کہا "بیگ صاحب آپ واقعی ایک عظیم اُستاد ہیں۔ ایک عظیم اُستاد کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنے طالب علموں کی ہر وقت رہنمائی کرنے کے لئے تیار رہے۔ ویسے معذرت کے ساتھ ایک ذاتی سا سوال آپ سے پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں۔ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی"؟

بیگ صاحب یہ سن کر ایک لمحے کے لئے کچھ پریشان سے ہوئے اور بولے "شادی کے جنجال میں پھنسنا کوئی اچھی بات نہیں۔ حالات ہی کچھ ایسے رہے۔ مجھے کبھی اس کا خیال تک نہیں آیا۔ میری عمر عزیز چالیس سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ اب شادی شدہ زندگی سے کچھ ڈر سا لگتا ہے، گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ پڑھنے لکھنے اور طالب علموں کے ساتھ وقت گذر جاتا ہے۔ شادی وادی کی اس مصیبت میں اپنے آپ کو کون گرفتار کرے"!

میں نے یہ سُن کر اس ذاتی معاملے میں اُنہیں زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ چُپ ہو رہا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک دن بیگ صاحب ذرا موڈ میں تھے اور دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اُن کے اس موڈ کو دیکھ کر اُن سے پوچھا "آپ تو خاص دلّی والے ہیں۔ صورت شکل، انداز اور طرزِ اظہار سے مغل شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ اپنے آباؤ اجداد اور اپنے خاندان کے بارے میں بتایئے"۔

اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہنے لگے My ancestors were Robbers

میرے آباؤ اجداد تو ڈاکو اور لٹیرے تھے۔ مغلوں کا تعلق منگولوں ہی سے تو ہے، اور اُن کا کام ابتدا میں لوٹ مار ہی کرنا تھا۔ میں مغل ہوں۔ تم مجھے مغل شہزادہ سمجھتے ہو۔ یہ تمہاری خوش فہمی اور حُسنِ ظن ہے۔ میاں! ہمارے خاندان نے بڑے سخت دن گذارے ہیں۔ غدر کے بعد سے اب تک ہم لوگ سنبھلے نہیں۔ غدر میں ہمارے خاندان پر ایسے ایسے مظالم ہوئے جن کو سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جب تسلّط ہوا تو ہمارے خاندان کی جائیداد وغیرہ ضبط کر لی گئی۔ ہم لوگوں کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ تقریباً ساٹھ ستّر سال اسی طرح گُذرے۔ پھر بدلے ہوئے حالات میں ہم لوگوں نے مغربی انداز کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ میں نے اینگلو عربک اسکول میں داخلہ لیا، پھر کالج میں پہنچا اور فلسفے اور نفسیات میں ام۔ اے کیا۔ اب کوئی بیس سال سے عربک کالج میں پڑھا رہا ہوں۔ وقت گذر رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے لئے ہارورڈ جانے کا ارادہ ہے۔ داخلہ تو ہو چکا ہے لیکن ابھی حالات ایسے ہیں کہ شاید جلد نہ جا سکوں۔ کوشش کر رہا ہوں۔ خدا نے چاہا تو کوئی صورت نکل آئے گی۔"

میں بیگ صاحب کی یہ باتیں چُپ چُپ سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد وہ پھر رواں ہوئے۔ کہنے لگے "آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ بچپن میں مجبوراً میں نے دودھ کی ایک دوکان کھولی تھی لیکن وہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے چلی نہیں۔ لیکن میں نے یہ کام ضروری سمجھ کر کیا۔ ہماری آمدنی کم تھی اور ہم بارہ بھائی بہن تھے۔ اتنے لوگوں کے اخراجات والد صاحب کی محدود آمدنی میں پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے سوچا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی کام کرنا چاہیئے۔ خیال آیا کہ دودھ کی دوکان بہتر رہے گی، لیکن مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ خاصا نقصان بھی ہوا۔ کاروبار کے لئے تجربہ ضروری ہے۔ مزاج کے ساتھ مطابقت بھی لازمی ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے محروم تھا۔"

غرض خاصی دیر تک بیگ صاحب مجھے اپنے حالات کی تفصیل سُناتے رہے۔ میرے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا کیونکہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنے اس قسم کے حالات کو چُھپاتے ہیں، اور اُن پر پردہ ڈالتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہ کہتے ہیں کہ پدرم سلطان بود۔ ہمارے آباؤ اجداد تو رئیس ابن رئیس تھے۔ بیگ صاحب نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کبھی حقائق کو

چھپاتے نہیں تھے، اور بغیر کسی جھجک کے اُن کو احباب، کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ میں نے ایسے کھرے، بے باک اور صاف گو انسان زندگی میں کم ہی دیکھے ہیں۔ بیگ صاحب اپنے مزاج کی اس خصوصیت سے پہچانے جاتے تھے۔

بیگ صاحب کے مزاج میں بذلہ سنجی بہت تھی۔ ہر وقت، ہنستے مسکراتے اور قہقہے لگاتے رہتے تھے۔ اُن کی کوئی بات بھی مزاح کے رنگ و آہنگ سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اُن پر اُداسی اور غمگینی کو طاری نہیں دیکھا۔ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی وہ ہنستے اور مُسکراتے تھے، اور ایسی باتیں کرتے تھے کہ افسردہ دل انسان بھی ہنسنے کے لئے مجبور ہو جاتا تھا۔

صبح کو کالج جانے سے پہلے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس وہ ہوسٹل میں رہنے والے اُستادوں کے پاس ضرور آتے تھے۔ ایک ایک کے دروازے پر دستک دیتے تھے۔ کمروں میں جھانکتے تھے، حال احوال پوچھتے تھے، اور اُن کی تنہائی کی زندگی کو دیکھ کر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہتے تھے، Get married Gentleman! as soon as possible.

——— حضرات! جلد از جلد شادی کر لیجئے"۔ مطلب یہ تھا کہ اُنہیں تنہائی کی زندگی سے نجات ملے۔ کیونکہ تنہائی تو ایک عذاب ہے۔

اسی طرح شام کو بھی اُن کا یہی معمول تھا۔ چند منٹ کے لئے ہر ایک کے کمرے میں ضرور آتے تھے۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلے جاتے تھے۔ مقصد لوگوں کی خیریت معلوم کرنا، اور تھوڑی دیر اُن سے گپ شپ کرنا ہوتا تھا۔ بیگ صاحب خاصے مجلسی آدمی تھے۔

گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت اینگلو عربک کالج ہوسٹل کی کھلی ہوئی وسیع و عریض چھت پر ہماری محفل جمتی تھی۔ بیگ صاحب بھی اوپر آجاتے تھے۔ دلچسپ محفل ہوتی تھی۔ کھانا بھی ہم لوگ ساتھ کھاتے تھے۔ ہم لوگوں کا کھانا تو ہوسٹل کے باورچی خانے سے آتا تھا۔ بیگ صاحب اپنا کھانا گھر سے منگواتے تھے۔ اُن کا نوکر سعد اللہ بیگ صاحب کے لئے خاص طور پر سادہ سا کھانا تیار کرتا تھا، اور ایک بہت بڑی سی سینی میں رکھ کر لاتا تھا۔ اس سینی میں سالن کی ایک پلیٹ اور دو تین چپاتیاں ہوتی تھیں۔ کھانے کے بعد ہم لوگ یا تو بیگ صاحب کی دلچسپ باتیں سُنتے تھے یا پھر اُن کی موٹر میں کناٹ پلیس چلے جاتے تھے۔

موٹر کسی جگہ کھڑی کر کے نئی دلّی کی زلفِ خوباں کی طرح دراز سڑکوں کی سیر کرتے تھے اور پھر کافی ہاؤس میں کافی پیتے تھے اور رات گئے وہاں سے واپس آتے تھے۔ برسوں ہم لوگوں کا یہی معمول رہا۔

کناٹ پیلس میں بیگ صاحب پر بعض اوقات عجیب و غریب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ کبھی وہ موٹر کسی جگہ روک دیتے تھے، اور کناٹ پیلس کے لان میں پیدل چلتے تھے۔ کبھی کسی دوکان پر کھڑے ہو کر چھ سات عدد کوکا کولا کی بڑی بوتلیں پیتے تھے۔ کبھی وہ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر چھ سات پیالیاں کافی کی پیتے تھے، اور پھر ہوسٹل میں واپس آکر رات رات بھر جاگتے تھے۔ کیونکہ اتنی کافی پینے کے بعد نیند اُڑ جاتی تھی۔ ہم لوگ بیگ صاحب کی اِن کیفیات کے خاموش تماشائی تھے۔ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ وہ تو بیگ صاحب تھے۔ ہمارے رہبر و رہنما اور سرپرست تھے۔ اُن سے کچھ کہنا، اُنہیں سمجھانا اور اُن کے سامنے زبان کھولنا آسان نہ تھا۔ وہ بھلا کب کسی کی سُنتے تھے! من مانی کرنا اُن کا مزاج تھا۔

اس زمانے میں ہم لوگ بیگ صاحب کے ساتھ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے عُرس کے موقع پر میلوں میں بھی جاتے تھے۔ اُن کے درباروں میں حاضری دے کر فاتحہ پڑھ کر اور دُعا مانگ کر ہم لوگ بیگ صاحب کے ساتھ ایک ایک دوکان پر جاتے تھے۔ بیگ صاحب ان دوکانوں سے سینکڑوں روپے کی چیزیں خریدتے تھے۔ بچوں کے لئے کھلونے، کپڑے، کھانے کی چیزیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ خریدتے اور پھر کسی دوکان پر کھڑے ہو کر چاٹ اور گول گپّے کھاتے تھے۔

میں اس موقع پر اکثر اُن سے کہتا تھا "یہاں آس پاس ہمارے کالج کے طالب علم بھی ہوں گے۔ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے کہ یہ کیسے پروفیسر ہیں کہ بازار میں کھڑے چاٹ کھا رہے ہیں۔

عربی کے پروفیسر ڈاکٹر فارق صاحب کہتے تھے "بیگ صاحب! یہ نہایت گندی چیزیں ہیں۔ گندگی سے تیار کی جاتی ہیں ان کو کھا کر اپنی صحت کو خراب نہ کیجیے"۔

لیکن بیگ صاحب ہم لوگوں کی بات نہیں سُنتے تھے۔ کہتے تھے "میاں! ہم میلے میں

آئے ہیں۔ میلے کے آداب یہی ہیں کہ اِن چیزوں کی داد دی جائے اور میلے کے آداب کو برتا جائے"۔

مجھے تو یہ چیزیں پسند تھیں۔ اس لئے میں تو بیگ صاحب کا ساتھ دیتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر فارق ان چیزوں کو چھوتے بھی نہیں تھے۔ ویسے یہ چیزیں واقعی مزے کی ہوتی تھیں۔ بیگ صاحب اِن چیزوں کو کھڑے کھڑے بڑے شوق سے مزے لے لے کر کھاتے تھے، اور ڈاکٹر فارق کی طرف دیکھ کر یہ شعر پڑھتے جاتے تھے ؎

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اِن میلوں کی دو کانوں سے بیگ صاحب جو چیزیں خرید کر لاتے تھے، وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں میں کئی کئی دن تک تقسیم کرتے رہتے تھے۔ بچے اِن چیزوں سے خصوصیت کے ساتھ بہت خوش ہوتے تھے۔ بیگ صاحب کو بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ بچوں کی نفسیات کے بہت بڑے ماہر تھے، اور اُن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُن کی لائی ہوئی چیزیں زیادہ تر بچوں کے لئے ہوتی تھیں۔

اُس زمانے میں اینگلو عربک کالج میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد فارق نے چھوٹی عمر کے ایک غریب بچے کو ملازم رکھ لیا تھا وہ بچہ فارق صاحب کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ خاص طور پر فرنیچر در و دیوار اور فرش وغیرہ کی صفائی اُس کے سپرد تھی۔ فارق صاحب کو صفائی سے عشق تھا۔ بہت صاف ستھرے رہتے تھے۔ اُن کی ہر چیز چمکتی تھی۔ وہ خود بھی صفائی کرتے تھے، اور سات آٹھ سال کے اس بچے سے بھی صفائی کا کام لیتے تھے۔ یہ بے چارہ دن بھر صفائی کے خیال سے فارق صاحب کی چیزوں کو رگڑتا رہتا تھا۔ مجھے اُس پر ترس آتا تھا۔

ایک دن دیکھا کہ یہ بچہ کمرے کے ایک کونے میں دیوار کی طرف منہ کئے کھڑا ہوا ہے۔ میں نے اُس کو اس عالم میں دیکھا تو فارق صاحب سے پوچھا اُس بچے کو کیا ہوا ہے، یہ کونے میں دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے کیوں کھڑا ہے؟

فارق صاحب نے کہا "اُس کو سزا ملی ہے۔ یہ بڑا بدمعاش لڑکا ہے۔ عبادت صاحب! یہ کھلونوں سے کھیلتا ہے"۔

مجھے یہ سُن کر اُس بچے پر بہت ترس آیا۔ لیکن میں فارق صاحب کے سامنے کچھ نہ بولا۔ چُپ رہا، اور سیدھا بیگ صاحب کے پاس گیا، اور اُن سے کہا "چند منٹ کے لئے ہماری طرف آیئے۔ آپ کو ایک عجیب و غریب منظر دکھانا چاہتا ہوں"۔

وہ میرے ساتھ فارق صاحب کی طرف آئے۔ بچے کو دیکھا کہ وہ کونے میں کھڑا ہے۔ اُنہوں نے فارق صاحب سے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا "فارق صاحب! اس بچے کو کیا ہوا ہے"؟

فارق صاحب بولے "یہ لڑکا ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتا۔ میں نے اس کو سزا دی ہے۔ یہ کھلونوں سے کھیلتا ہے"۔

بیگ صاحب یہ سُن کر اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکے۔ اُنہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اور فارق صاحب سے کہا کہ "یہ بچہ ہے کھلونوں سے نہیں کھیلے گا تو اور کیا کرے گا؟ اس کو تو کھلونوں سے ضرور کھیلنا چاہیئے۔ میں اس کو ابھی تھوڑی دیر میں بہت سے کھلونے لاکر دوں گا تاکہ یہ ان سے خوب کھیلے"۔

فارق صاحب کہنے لگے "آپ نے اپنے نوکر سعداللہ کو تو برباد کیا ہی ہے۔ اس لڑکے کو بھی برباد کر دیں گے"۔

بیگ صاحب نے پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا، اور کہا "اُس کو برباد کرنا ہی چاہیئے"۔

اور یہ کہہ کر اس بچے کو عذاب سے نجات دلائی کہ "جا، سعداللہ کے پاس جا، اور تھوڑی دیر اس کے ساتھ کھیل وہاں کھلونے بھی رکھے ہیں۔ میں تجھے اور بھی بہت سے کھلونے لاکر دوں گا۔ ان سے خوب کھیلنا"۔

فارق صاحب نے یہ سب کچھ سُنا لیکن خاموش رہے۔ بیگ صاحب کے سامنے کیا بولتے!

دوسرے دن بیگ صاحب نے اس بچے کو بلا مبالغہ ڈھیروں کھلونے لاکر دیئے،

اور وہ بہت خوش ہوا۔ فارق صاحب بھی بیگ صاحب کی باتوں سے موم ہو گئے۔
بچّے تو خیر بچّے تھے جو بیگ صاحب کو بہت عزیز تھے، لیکن بڑوں کا بھی وہ اسی طرح بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ تاریخ کے پروفیسر سیّد حسن اپنے ساتھ اپنے وطن الہ آباد سے ایک ملازم لے آئے۔ گاؤں کا آدمی تھا لیکن کھانا بہت اچھا پکاتا تھا۔ شامی کباب بنانے میں تو اس کو مہارت حاصل تھی۔ بڑے مزے کے کباب بناتا تھا۔ بیگ صاحب اور ہم سب اُس کی تعریف کرتے تھے۔ بیگ صاحب اکثر اس سے اس کے حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔

ایک دن بیگ صاحب نے اس سے پوچھا تیرے۔ بیوی بچے کہاں ہیں؟"
اُس نے کہا "ابھی چند مہینے ہوئے میری شادی ہوئی ہے۔ بیوی میری گاؤں میں ہے۔ بہت اچھی ہے۔ اُسے پوڈر سُرخی لگانے کا بہت شوق ہے۔ اور پوڈر لگا کر وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ میں تو صاحب کے ساتھ یہاں آگیا، اور اُس کو اپنے ماں باپ کے پاس چھوڑ آیا۔ اب اسے پوڈر وغیرہ کون لا کر دیتا ہوگا"؟
بیگ صاحب نے کہا "تو فکر نہ کر، میں اس کے لئے پوڈر سرخی لا کر دوں گا، تجھے چھٹی دلواؤں گا۔ تجھے گھر بھیجوں گا۔ اگلے ہفتے تو ضرور گھر جائے گا۔"
دوسرے دن بیگ صاحب، پوڈر، سرخی کریم، اور کاسمیٹک کا خدا جانے کیا کیا سامان اُس کے لئے خرید کر لائے، یہ چیزیں اس کو دیں، اور سید حسن سے کہا "اس کو آٹھ دس دن کی چھٹی دیجیئے تاکہ یہ گھر جائے اور چند روز اپنی نئی دلہن کے ساتھ رہ کر واپس آئے، بلکہ ممکن ہو تو اس کو اپنے ساتھ لے آئے اور یہاں اطمینان سے رہے"۔
سیّد حسن اُس کو چھٹی دینے پر مجبور ہوئے اور وہ اپنی دلہن کے لئے بیگ صاحب کا لایا ہوا سامان لے کر اپنے گھر الہ آباد چلا گیا، اور پندرہ دن کے بعد واپس آیا۔
بیگ صاحب اور ہم سب بہت خوش ہوئے۔
غرض بیگ صاحب اس طرح بڑوں اور بچوں سب کا خیال رکھتے تھے۔ انسانوں کی

مزاج دانی اور انسان دوستی اُن کی شخصیت کی نمایاں ترین خصوصیت تھی۔

ایک دن بیگ صاحب ہم لوگوں کے سامنے اپنے بچپن کے کچھ واقعات بیان کر رہے تھے۔ ایک واقعہ اُنہوں نے ایسا بیان کیا جس کو میں آج تک بھولا نہیں۔

کہنے لگے "جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو ہمارے ایک مسلمان ماسٹر بہت سخت تھے، مارتے بہت تھے۔ اس لئے ہم اُن کی کلاس سے بھاگ کر فیروز شاہ کے کوٹلہ چلے جاتے تھے۔ وہاں سارا دن گذارتے تھے اور چھٹی کے وقت گھر واپس آجاتے تھے۔ ایک دن میں نے چلتے وقت فاختہ کے ایک گھونسلے سے دو بچّے نکالے اور اُن کو گھر لے گیا۔ جب میری والدہ نے فاختہ کے یہ بچّے دیکھے تو بہت ناراض ہوئیں، مُجھ پر بُری طرح برسیں۔ مُجھے ڈانٹا پھٹکارا، اور کہا کہ اِن کو فوراً واپس لے جاؤ اور گھونسلے میں رکھ کر آؤ۔ بچوں کو اُن کے ماں باپ سے جُدا کرنا بڑا ظلم ہے۔" مغرب کا وقت ہو گیا تھا لیکن میں نے والدہ کے حُکم کی تعمیل کی، اور کوٹلہ فیروز شاہ جا کر فاختہ کے ان بچوں کو اُن کے گھونسلے میں رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی کسی انسان یا جانور کو تکلیف نہیں پہنچائی"۔

بیگ صاحب کی شخصیت پر اس قسم کے واقعات کا بہت اثر ہوا، اور کسی کو تکلیف نہ پہنچانا اُن کے مزاج کا جُز بن گیا۔ وہ کسی انسان یا جانور کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کبھی کسی کی بُرائی نہیں کرتے تھے۔ انسان کو مجبور و معذور سمجھتے تھے، اور ہر شخص کو حتی الامکان خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ انسانوں کی خدمت کرنا اُن کا نصب العین تھا۔ وہ کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آنا اُن کے مزاج کی نمایاں ترین خصوصیت تھی۔ اختلاف کی وجہ سے وہ کسی کے ساتھ نفرت نہیں کرتے تھے۔ نفرت کا لفظ اُن کی لغت میں نہیں تھا۔ دشمن تک سے وہ پیار کرتے تھے لیکن اُن کا دشمن کوئی نہیں تھا۔

انسانی رشتوں کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے، اور عزیزوں اور دوستوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حسب مراتب تحفے تحائف دینے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ شہر میں بھی کہیں جاتے تھے تو عزیزوں اور دوستوں کو تقسیم کرنے کے لئے کچھ چیزیں خرید کر ضرور لاتے

تھے کئی کئی دن تک یہ چیزیں شہر میں تقسیم کی جاتی تھیں۔

ایک دن بیگ صاحب نے مجھ سے کہا "مہرولی چلو گے؟"

میں نے کہا "ضرور چلئے۔ میرے لئے تو وہاں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دینا ایک سعادت ہے۔ فاتحہ پڑھیں گے اور دُعائیں مانگیں گے۔"

بیگ صاحب بولے "ہاں بھئی، قطب صاحب میں فاتحہ بھی پڑھیں گے، دعائیں بھی مانگیں گے۔ آس پاس کے تاریخی مقامات کی سیر بھی کریں گے، اور وہاں سے سنگھاڑے بھی لائیں گے وہاں ایک جھیل ہے۔ اس کے سنگھاڑے بہت مزے دار ہوتے ہیں۔"

چنانچہ ہم لوگ صبح کے وقت اُن کی موٹر میں مہرولی روانہ ہوئے۔ سیدھے قطب صاحب کی درگاہ پہنچے۔ حاضری دی۔ فاتحہ پڑھی اور دُعا مانگی۔ اس کے بعد کئی گھنٹے تک آس پاس کے تاریخی مقامات کی سیر کی۔ دوپہر کے بعد جھیل پر پہنچے۔ بیگ صاحب نے وہاں سے من بھر سنگھاڑے خریدے۔

میں نے کہا "اتنے سنگھاڑوں کا آپ کیا کریں گے، اور دِلّی تک کس طرح لے جائیں گے؟"

بیگ صاحب نے کہا "موٹر میں بھر لیں گے۔ فکر نہ کیجئے۔ ہم لوگ سنگھاڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر بیگ صاحب نے موٹر میں ہر طرف سنگھاڑوں کے انبار لگا لئے۔ ڈگی کے اندر، سیٹوں کے نیچے اوپر، ہر طرف سنگھاڑے ہی سنگھاڑے تھے اور واقعی ہم لوگ اِن سنگھاڑوں پر بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح دِلّی پہنچے۔ کانٹے بھی بہت چُبھے، کپڑے بھی پھٹے۔ زخم بھی لگے۔ خون بھی نکلا لیکن بہرحال سنگھاڑے اِس طرح دِلّی پہنچ گئے۔ بیگ صاحب نے دوستوں اور عزیزوں کے ایک ایک گھر میں جاکر اِن سنگھاڑوں کو تقسیم کیا۔

دِلّی واپس پہنچ کر میں نے بیگ صاحب سے کہا "میں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔ من بھر سے زیادہ سنگھاڑے لاد کر لے آئے۔"

وہ کہنے لگے "میاں! یہ سنگھاڑے مہرولی کا تحفہ ہیں۔ یہ عزیزوں اور دوستوں تک

پہنچیں گے تو اُنہیں خوشی ہوگی ـــــ اور لوگوں کو خوش کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔آج تو میں اسی مقصد سے قطب صاحب گیا تھا۔ تم لوگوں کو بھی میں نے تکلیف دی۔ اس کا ثواب تمہیں بھی ضرور ملے گا۔"

میں نے کہا "ہم لوگوں کو تو یہ ثواب کھاتے ہی مل ملا۔ قطب صاحب کے دربار میں حاضری بھی دی۔ سیر بھی کی سنگھاڑے بھی کھائے، اور دوستوں کے لئے سنگھاڑے لاکر ثواب بھی حاصل کیا"۔

پروفیسر مرزا محمود بیگ صاحب خاص دِلّی والے تھے، اور اُن کی زندگی کا انداز بھی خاص دِلّی والوں کا تھا۔ عادتیں بھی دِلّی کے شرفا کی تھیں۔ رہن سہن بھی دِلّی والوں کا تھا۔

دِلّی کی نہاری وہاں کی خاص چیز تھی، اور شرفا اس کو بڑے اہتمام سے کھاتے تھے۔ بیگ صاحب سردیوں کے موسم میں کئی بار نہاری کی دعوت کرتے تھے۔ منہ اندھیرے خود جاکر نہاری لاتے تھے، اور احباب کو بڑی محبت سے کھلاتے تھے۔

اس دعوت کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ انگیٹھیاں سُلگائی جاتی تھیں۔ چاندنی کا فرش بچھایا جاتا تھا۔ تانبے کی رکابیوں پر قلعی کرائی جاتی تھی۔ یہ صاف ستھری اور چمکتی ہوئی رکابیاں احباب کے سامنے رکھی جاتی تھیں۔ ایک بڑی سی قاب میں ادرک، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا کاٹ کر سلیقے سے رکھا جاتا تھا۔ نہاری کی دیگچیاں انگیٹھیوں پر رکھ دی جاتی تھیں۔ بیگ صاحب اِن دیگچیوں میں سے گرم گرم نہاری نکال کر مہمانوں کی رکابیوں میں ڈالتے تھے، اور گرم گرم تندوری روٹیوں کے ساتھ اس نہاری کو کھا کر بیگ صاحب کے سلیقے کی داد دیتے تھے۔ رکابیوں میں کھاتے کھاتے جب نہاری ٹھنڈی ہونے لگتی تو بیگ صاحب ان رکابیوں کو انگیٹھیوں پر رکھتے اور جب وہ پھر گرم ہو جاتی تو پھر مہمانوں کے سامنے رکھتے۔ غرض بیگ صاحب کی نہاری کی اِن دعوتوں میں جشن کا سا سماں ہوتا تھا، اور دِلّی کی معاشرتی اور تہذیبی روایت اپنے شباب پر نظر آتی تھی۔

بیگ صاحب بڑے ہی وضع دار انسان تھے۔ اُنہیں دِلّی کے مسلمانوں کی تہذیب کا مثالی نمونہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔ حفظِ مراتب کا وہ خاص خیال رکھتے تھے۔ بزرگوں

کا ادب کرتے تھے۔ ہم عمر لوگوں سے محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چھوٹوں پر شفقت فرماتے تھے۔ آداب کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ ہم لوگ اکثر ہوٹلوں اور ریستورانوں میں اُن کے ساتھ جاتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بیگ صاحب ساتھ ہوں اور ہم بل ادا کر دیں۔ ہم کوشش ضرور کرتے تھے لیکن بیگ صاحب یہ کہہ کر ہمیں روک دیتے تھے کہ "میاں بل تو ہمیشہ بزرگ ہی ادا کرتا ہے۔ تم لوگ وضع داری کا خون کیوں کرنا چاہتے ہو، اور مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہو؟ یہ آداب کے خلاف ہے۔ البتہ کبھی سامان اُٹھانے کی نوبت آئے گی تو تم سے اُٹھوایا جائے گا۔ علی گڑھ نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ دلی کی تہذیب نے ہمیں یہی درس دیا ہے"۔

اور بیگ صاحب کی یہ باتیں سُن کر ہم لوگ خاموش ہو جاتے تھے۔

بیگ صاحب اپنے زمانے کے ایک عظیم اُستاد تھے۔ اُن کے علم کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ زیادہ وقت وہ پڑھنے لکھنے میں گذارتے تھے، اور اِن معمولات نے انہیں علم کا ایک بحرِ ذخار بنا دیا تھا۔ بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک سمندر موج زن ہے۔ لہجے میں ایسی شیرینی تھی جو شہد و شکر کو مات کرتی تھی آواز میں ایسا دھیما پن تھا جو کسی دریائے نرم خرام میں ہوتا ہے۔ الفاظ ایسے ڈھلے ڈھلائے جیسے ابھی کسی سانچے میں سے نکل کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ باتیں کرتے یا لکچر دیتے تھے تو لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔

مرزا صاحب کا اخلاق بہت بلند تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے تھے۔ ہر ایک کی عزّت کرتے تھے۔ کوئی اُن سے ملنے آئے تو فوراً باہر تشریف لے آتے تھے، اور اُس سے اپنے مخصوص انداز میں دلچسپ باتیں کر کے اطمینان اور طمانیت کی دولت بیش بہا سے مالا مال کر کے اُس کو رخصت کرتے تھے۔ طالب علم تو انہیں شمع سمجھ کر ہمیشہ پروانوں کی طرح گھیرے رہتے تھے، اور وہ ایک شمع روشن بن کر اُن کو روشنی سے ہم کنار کرتے تھے۔ انہیں کبھی غصّہ نہیں آتا تھا۔ اختلاف کو برداشت کرنے کی تو اُن میں ایسی صلاحیت تھی جو میں نے کسی اور شخص میں نہیں دیکھی۔ وہ کبھی کسی کی بُرائی نہیں کرتے تھے کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ اس کو یہ کہہ کر معاف کر دیتے تھے کہ "انسان تو مجبور ہے۔ غلطی

کرنا اُس کی فطرت ہے۔"

میں نے بیگ صاحب کو کبھی اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ بڑے ہی دھیمے لہجے میں باتیں کرتے تھے، اور اُن کا ہر لفظ رس میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ وہ ہر لفظ کو تول تول کر زبان پر لاتے تھے، اور اُن کی آواز ایسی رسیلی ہوتی تھی معلوم ہوتا تھا شہد و شکر میں لپٹی ہوئی ہے۔ اونچی تیز اور دھار دار آواز کو وہ سُن بھی نہیں سکتے تھے۔ کبھی کوئی اونچی آواز میں اُن کے سامنے بات کرتا تو ہمیشہ کہتے تھے "ذرا آہستہ بولیے۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ اونچی آواز دھار دار ہوتی ہے۔ زخمی کر دیتی ہے"۔ اس معاملے میں وہ بڑے ہی حساس انسان تھے۔

اُس زمانے میں بیشتر لوگ ریڈیو سے دل بہلاتے تھے، اور اونچی آواز میں ریڈیو لگاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اُس کی آواز ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھروں تک جاتی تھی، اور فضا میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا تھا۔ ہم لوگ اینگلو عربک کالج کے جس بلاک میں رہتے تھے، وہاں ہر کمرے میں ریڈیو تھا۔ صبح اور دوپہر کے وقت بیشتر لوگ تیز آواز میں ریڈیو لگاتے تھے۔ بیگ صاحب آواز کی اس بلند آہنگی کو سُن کر باہر آ جاتے تھے، اور کہتے تھے "میاں! ذرا ریڈیو کو آہستہ کرو تاکہ میں تم سے باتیں کر سکوں"۔ اور جس سے وہ یہ بات کرتے تھے وہ شرمندہ ہو کر ریڈیو کی آواز کو آہستہ کر دیتا تھا، بلکہ اکثر لوگ تو بیگ صاحب کو دیکھتے ہی اپنے ریڈیو کو بند کر دیتے تھے، اور بیگ صاحب کو اس صورتِ حال سے اطمینان نصیب ہوتا تھا۔

بیگ صاحب تنہا آدمی تھے، اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے کی اُنہیں عادت سی ہو گئی تھی۔ شادی کا بکھیڑا اُنہوں نے نہیں پالا تھا۔ پینتالیس سال کے قریب اُن کی عمر ہو گئی تھی لیکن انہوں نے اب تک یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس حصار میں داخل ہوں گے۔ اُن کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی کہ ہندو سکھ اور مسلمان لڑکیاں اُن کے پیچھے پیچھے پھرتی تھیں اور انہیں پسند کرتی تھیں۔ لیکن بیگ صاحب اُن کے ساتھ ہمیشہ ایک فاصلہ رکھتے تھے۔ اُن سے اچھی طرح ملتے تھے۔ اُن پر شفقت بھی فرماتے تھے، لیکن کبھی اُن سے قریب ہونے کا خیال اُن کے دل میں نہیں آتا تھا۔ اُن کی شفقت اور محبت میں ایک پدرانہ رنگ و آہنگ تھا اور اسی میں اُن کی بڑائی تھی۔ وہ بڑے ہی پاکدامن آدمی تھے۔

زندگی میں صرف ایک بار انہیں شادی کا خیال آیا۔ لیکن اس میں جذبے سے زیادہ عقل کا ہاتھ تھا۔ اب اُن کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اس لئے انہیں گھر بسانے کا خیال آیا اور اُنہوں نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا جو دلّی کے ایک مشہور مسلمان خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہ اعلےٰ تعلیم یافتہ تھی۔ عُمر بھی اس کی چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ سب کچھ طے ہو گیا لیکن اس کی والدہ نے ایک لاکھ روپیہ مہر کی پابندی لگا دی۔ بیگ صاحب نے اپنے حالات کے پیشِ نظر اس سے اتفاق نہیں کیا، اور اس طرح آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔

ایک زمانے تک تنہائی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے بیگ صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب سا خلا پیدا ہو گیا تھا، اور وہ دُنیاوی چیزوں سے بے نیاز سے ہو گئے تھے۔ نمود و نمائش سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ مادّی چیزوں کا اُنہیں کبھی خیال تک نہیں آتا تھا۔ گھر میں اُن کے فرنیچر اور اُن کی کتابوں اور کاغذوں پر گرد بکھری رہتی تھی، اور نہ تو وہ ان کو خود چھیڑتے تھے اور نہ دوسروں کو چھیڑنے دیتے تھے۔ اُن کا نوکر، جو اُن کی دیکھ بھال کرتا تھا، اُس نے بھی بیگ صاحب کے اس مزاج سے مطابقت پیدا کر لی تھی، اور وہ بس کبھی کبھی ہی بیگ صاحب کے کمروں کی صفائی کرتا تھا۔ میں تو جب بھی اُن کے ہاں گیا دیکھا کہ اُن کے گھر کی ہر چیز گرد میں اَٹی ہوئی ہے۔ اسی ماحول میں وہ کام کرتے رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ "کمروں کی صفائی ہونی چاہئے لیکن صفائی سے ہر چیز منتشر ہو جاتی ہے، اور اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے۔ صفائی خود کرنی چاہئیے۔ کوئی دوسرا صفائی کرے تو ہر چیز میرے لئے اجنبی ہو جاتی ہے اور مجھے ہر چیز کے لئے اجنبی اور نامانوس بنا دیتی ہے۔"

لباس کے معاملے میں البتہ بیگ صاحب باقاعدگی کا اظہار کرتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں سفید رنگ کی بوسکی یا سلک کی بش شرٹ پہنتے تھے اور یہ لباس اُن کے گورے چٹے جسم پر بہت اچھا لگتا تھا۔ سردیوں میں وہ نیلے یا کشمشی رنگ کے سرج کا سوٹ یا سیاہ رنگ کی شیروانی پہنتے تھے۔ اس لباس میں اُن کی وجاہت اپنے شباب پر نظر آتی تھی، اور اُن کی جامہ زیبی ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ گھر میں وہ ململ کا سفید کُرتا اور بڑے پائنچوں کا پاجامہ

پہنتے تھے، اور اس لباس میں اُن کا چمپئی رنگ اپنی بہار دکھاتا تھا۔ ہوسٹل میں ہم لوگوں سے ملنے آتے تھے تو اس پر ڈریسنگ گاؤن پہن لیتے تھے جو اُن کے بھاری بھرکم جسم پر رعب و دبدبے کا مزید اضافہ کر دیتی تھی۔ ہم لوگ اسی وجہ سے انہیں "ڈیوک" کہتے تھے۔

بیگ صاحب کی زندگی داخلی طور پر بھی بڑی پاک صاف تھی۔ وہ بڑے ہی دیانت دار آدمی تھے اور یہ دیانت داری اُن کی زندگی کے ہر پہلو میں اپنا جلوہ دکھاتی تھی۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے، اور جو کچھ اُن کے دل میں ہوتا تھا وہ اُن کی زبان پر آجاتا تھا۔ وہ دوٹوک بات کرنے کے عادی تھے۔ میں اکثر کالج اور یونیورسٹی کی میٹنگوں میں اُن کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ بیگ صاحب اِن میٹنگوں میں اپنے خیالات کا اظہار کُھل کر کرتے تھے۔ البتہ تہذیب و شائستگی کا دامن سچائی کے اِس اظہار میں بھی اُن کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا تھا۔

ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔

قیام پاکستان سے چند مہینے قبل پروفیسر ہارون خاں شیروانی کا تقرر اینگلو عربک کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حُسین قریشی صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے انہیں خاص طور پر آفر بھیج کر بُلایا تھا۔ وہ حیدر آباد دکن سے دلّی آئے اور پرنسپلی کا چارج لیا تو اُس وقت وہ دہلی یونیورسٹی اور اینگلو عربک کالج کے ماحول سے پوری طرح آشنا نہیں تھے۔ اس زمانے میں کالج کے سینئر اساتذہ ہفتے میں تین چار دن ام۔ اے اور بی۔ اے آنرز کی جماعتوں کو لیکچر دینے کے لیئے یونیورسٹی جاتے تھے، اور تین دن کالج میں لیکچر دیتے اور ٹوٹوریل وغیرہ لیتے تھے۔ یہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گوائر کا بنایا ہوا انتظام تھا۔ اس کی پابندی ضروری تھی۔

شیروانی صاحب حیدر آباد کے ریاستی ماحول میں رہے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی کا نظام اُن کے پیشِ نظر تھا۔ اس لئے اساتذہ کی پہلی ہی میٹنگ میں انہوں نے کہا کہ "مجھے اساتذہ کی مصروفیات کا علم نہیں ہوتا۔ اس لیئے میں چاہتا ہوں کہ کالج میں اساتذہ کی حاضری کے لئے ایک رجسٹر رکھا جائے جس میں وہ روزانہ کالج آکر اس میں دستخط کریں"۔

بیگ صاحب کو یہ بات اچھی نہیں لگی کیونکہ ایک تو اس میں برسوں کی بنی ہوئی روایت

مجروح ہوتی تھی دوسرے شک وشبہ کا یہ پہلو نکلتا تھا کہ اساتذہ اپنے کام میں مخلص نہیں ہیں۔ اس لئے جب شیروانی صاحب نے میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی تو بیگ صاحب سب سے پہلے بولے اور کہا کہ "میں اس تجویز کی مخالفت کرتا ہوں۔ اس کالج کی تاریخ میں کبھی ایسا ہوا نہیں کہ اساتذہ کی حاضری کے لئے رجسٹر رکھا جائے۔ اس سے اساتذہ پر شبہ کا یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ وہ اپنے کام میں مخلص نہیں ہیں"۔

یہ بات سن کر شیروانی صاحب کو غصّہ آگیا۔ ناراضگی کا اظہار کیا۔ چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بیگ صاحب اور تمام اساتذہ نے اس پر احتجاج کیا۔ بالآخر شیروانی صاحب کی تجویز پاس نہ ہوسکی میٹنگ ختم ہوئی تو باہر نکل کر ہم سب نے بیگ صاحب کی جرأت رندانہ کی داد دی اور اُن کے دوٹوک بات کہنے کے انداز کو سراہا۔

یہ بات کسی طرح یونیورسٹی کے وائس چانسلر سرماریس تک بھی پہنچی۔ اُنھوں نے بھی بیگ صاحب سے اتفاق کیا۔ سرماریس اساتذہ کی بہت عزّت کرتے تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ اُستادوں پر کبھی شبہ نہیں کرنا چاہئے۔" اُن کا احترام ضروری ہے۔

بیگ صاحب بُنیادی طور پر ایک پروفیسر تھے، اور انتظامی معاملات میں انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن جب قیام پاکستان کے بعد وہ اینگلو عربک کالج کے پرنسپل ہوئے تو انتظامی معاملات میں بھی اُنھوں نے اپنے جوہر دکھائے، اور کالج کی تنظیم نو کرکے اُس کو انتہائی بلندیوں سے ہم کنار کردیا۔ آزادی کے ساتھ دِلّی کو جس آشوب قیامت سے دوچار ہونا پڑا، اُس نے مسلمانوں کے اس کالج کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بیگ صاحب کو اس کالج سے بڑی محبت تھی۔ اس لئے وہ قیام پاکستان کے بعد بھی لُٹ پٹ کر دِلّی ہی میں رہے اور جگر لخت لخت کو جمع کرکے انہوں نے اپنی خداداد انتظامی صلاحیتوں اور کام کرنے کی دُھن اور لگن سے عربک کالج کو دہلی یونیورسٹی کا ایک اہم کالج بنادیا۔ اس کام کے لئے وہ تنہا دِلّی میں رہے حالانکہ اُن کے خاندان کے تمام افراد پاکستان چلے گئے تھے۔

یہ زمانہ بیگ صاحب کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔

قیام پاکستان سے قبل ہی ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ نے اینگلو عربک کالج کی مخالفت

شروع کردی تھی کیونکہ یہ کالج مسلم لیگ کا قلعہ تھا۔ قائد اعظمؒ اس کے سرپرست اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب اس کے صدر تھے۔ مسلم لیگ کے جلسے اسی کالج میں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان متعصب ہندو جماعتوں نے فسادات کے زمانے میں اس کالج پر کئی بار حملے کئے اور جو اساتذہ اور طلباء یہاں رہتے تھے اُن کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کالج کے پروفیسروں اور طالب علموں کو ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب کے مشورے پر کالج کو چھوڑ کر اُن کی جائے قیام "گل رعنا" میں پناہ لینی پڑی، اور پھر پرانے قلعے میں اُنہیں دِلّی کے مسلمانوں کے لئے رفیوجی کیمپ قائم کرنا پڑا۔ کالج میں لوٹ مار ہوئی تو اُس کو مدراس رجمنٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح کم از کم اس کی عمارت محفوظ رہی۔ جب کئی مہینے بعد فساد کی آگ کا زور کم ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد اور ذاکر حسین خاں صاحب کے ایما پر بیگ صاحب نے اس کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ سب سے زیادہ سینئر پروفیسر ہونے کی حیثیت سے وہ اس کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے۔ اس طرح اُنہوں نے اس کی بحالی کے لئے شب و روز کام کیا۔ بالآخر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی، اور اپریل ۱۹۴۸ء میں کالج پھر کُھل گیا۔

یہ بیگ صاحب کا کارنامہ تھا۔

اس زمانے میں مجھے بیگ صاحب کے ساتھ انتظامی نوعیت کے کام کرنے کا موقع مِلا۔ اس زمانے میں میں دن رات بیگ صاحب کے ساتھ کام کرتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہم لوگوں نے اُن طالب علموں کے سرٹیفکیٹ وغیرہ بنائے جو لُٹ پٹ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ یہ سرٹیفکیٹ ہم لوگوں نے پاکستان بھیج دیئے تاکہ انہیں وہاں تعلیم جاری رکھنے میں کوئی دُشواری پیش نہ آئے۔ پھر ہم لوگوں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر ماریس گوائر سے رابطہ قائم کیا۔ اُن سے مُفصّل مُلاقات کی اور گرانٹ بحال کروائی۔ جو پروفیسر اور دفتر کے لوگ ہندوستان میں رہ گئے تھے، اُن کی تنخواہوں کے ادا کرنے کا انتظام کیا۔ یہ لوگ باقاعدگی سے کالج آنے لگے۔ کچھ مسلمان طالب علموں کو بھی ہم نے کالج میں داخل کر لیا، اور اس طرح کالج کی زندگی معمول کے مطابق رواں دواں نظر آنے لگی۔ اس کام میں بیگ صاحب

کی انتظامی صلاحیت، اَن تھک محنت اور مولانا آزاد، ذاکر صاحب اور سر ماریس کی شفقت اور محبت کا بڑا ہاتھ تھا۔

بیگ صاحب نے اس زمانے میں کالج کے دفتر میں پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ یہیں کام کرتے تھے اور یہیں رات کو ایک گدّے پر سو جاتے تھے۔ اور صبح کو اُٹھ کر یہیں پھر کام شروع کر دیتے تھے۔ دن میں دِلّی کی سڑکوں کو ناپنا بھی اُن کے معمولات میں داخل تھا۔ کبھی یونیورسٹی جاتے۔ کبھی وزارتِ تعلیمات اور وزارتِ مالیات کے چکّر لگاتے۔ وزیروں اور اربابِ اختیار سے ملتے۔ وائس چانسلر سے مُلاقاتیں کرتے۔ سیاسی رہنماؤں سے باتیں کرتے تاکہ مسلمانوں کے ایک لُٹے پٹے کالج کے حالات معمول پر آجائیں۔ تقریباً ایک سال تک بیگ صاحب کا یہی معمول رہا، اور اس کے نتیجے میں اینگلو عربک کالج ایک دفعہ پھر زندہ ہوگیا۔ البتہ کام کے بوجھ کی وجہ سے اس زمانے میں بیگ صاحب کی شگفتگی ختم ہوگئی۔ اُن کو دیکھ کر اس زمانے میں یہ احساس ہوتا تھا کہ اُن کے ذہن پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہے، اور وہ اس کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

سال ڈیڑھ سال کی اس مسلسل محنت اور ان تھک جدوجہد کے نتیجے میں عربک کالج تو بحال ہوگیا لیکن بیگ صاحب کی صحت نے جواب دے دیا۔ اُن کے چہرے کی سُرخی زردی میں تبدیل ہوگئی۔ اور وہ مسلسل کام کرنے کی وجہ سے بیمار رہنے لگے۔ لیکن قوت ارادی اُن میں ایسی تھی کہ یہ بیماری بھی اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اس عالم میں بھی وہ شب و روز کام کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اینگلو عربک کالج دیکھتے دیکھتے ایک دفعہ پھر دہلی یونیورسٹی کا ایک اہم کالج شمار کیا جانے لگا، اور لوگ اس کو ایک بار پھر عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

آزادی کے بعد بیگ صاحب تقریباً پندرہ بیس سال کالج کے پرنسپل رہے۔ ان کی عمر اب ساٹھ سال سے زیادہ ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ خود کالج کی پرنسپلی سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن اُن کا علمی اور تعلیمی کام اس کے بعد بھی جاری رہا۔ وہ یونیورسٹیوں کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر رہے اور انہیں دہلی یونیورسٹی میں نفسیات کی اعزازی پروفیسر شپ بھی مل گئی اس زمانے میں انہوں نے تدریس و تحقیق کے کاموں میں اپنا وقت گذارا، اور بے شمار علمی کارنامے

انجام دیئے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ بیگ صاحب ایک صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ اُن کے ہلکے پھلکے مضامین رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ ریڈیو سے اُنھوں نے معاشرتی، تہذیبی اور ادبی موضوعات پر بے شمار تقریریں نشر کیں جن میں سے ہر ایک میں ادبی رنگ و آہنگ تھا۔ اِن تقریروں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ افسوس ہے کہ مرزا صاحب کی بے نیازی نے اِن تقریروں کو یک جا کر کے شائع نہیں کیا۔ حالانکہ اِن میں جو ادبیت ہے جو لطیف مزاح ہے اور زبان کی جو چاشنی ہے، وہ انھیں ایک صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز ثابت کرتی ہے۔

بیگ صاحب ایک اعلےٰ درجے کے انسان، ایک بلند مرتبہ ماہر تعلیم، ایک بہت بڑے پروفیسر، ایک جید عالم، ایک مخلص دوست اور مزاج کے اعتبار سے ایک باغ و بہار آدمی تھے۔ اُن کی صحبت میں گذارے ہوئے لمحے پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کا سماں پیش کرتے ہیں اور اُن کی یاد میدانوں اور سبزہ زاروں میں دور دور تک چھٹکی ہوئی چاندنی کا روپ اختیار کر کے آنکھوں کو نور اور دلوں کو سرور کی دولت بیش بہا سے مالا مال کرتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید احمدؒ فارِق

ڈاکٹر خورشید احمدؒ فارق اینگلو عربک کالج دہلی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر اور میرے دوست، رفیق کار اور پڑوسی تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فاضل عربی اور اسلامیات کے مشہور عالم پروفیسر عبدالعزیز میمن صاحب کے شاگرد اور علوم اسلامی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اُن کا زیادہ وقت پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں گذرتا تھا۔ وہ دُنیا کے آدمی نہیں تھے۔ سوائے پڑھنے لکھنے کے اُنہیں دُنیا کے کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ اُن کا کوئی دوست نہیں تھا وہ کسی سے ملتے بھی نہیں تھے۔ صرف کتابیں اُن کی رفیق اور دوست تھیں، اور وہ اپنا سارا وقت انہیں کتابوں کے ساتھ گذارتے تھے۔ صرف لڑکوں کو پڑھانے کے لئے وہ گھر سے باہر نکلتے تھے اور پھر لکچر دے کر اپنے کمرے میں واپس آجاتے تھے۔ دِلّی کی کوئی سڑک اُنھوں نے نہیں دیکھی تھی۔ وہ کبھی کسی بازار میں نہیں گئے تھے۔ سوائے طالب علموں اور اُستادوں کے کسی شخص سے اُن کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

میں جس دن اینگلو عربک کالج میں اُستاد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے پہنچا تو سب سے پہلے اُن سے میری مُلاقات ہوئی۔ کالج ہوسٹل میں اساتذہ کے لئے جو بلاک مخصوص تھا، فارق صاحب اُس کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ مجھے اُن کے کمرے

کے برابر کمرہ دیا گیا۔ جب انہیں میرے آنے کا علم ہوا تو وہ میرے کمرے میں آئے، بڑے تپاک سے ملے۔ مصافحہ کیا، اور اس طرح باتیں کیں جیسے برسوں کی شناسائی ہے۔

کہنے لگے "میں اپنا تعارف خود ہی کرا دوں۔ میرا نام خورشید احمد فارق ہے۔ میں یہاں عربی اور اسلامی علوم پڑھاتا ہوں۔ میں جب علی گڑھ میں ام۔ اے کر رہا تھا، اُس وقت سے آپ کو جانتا ہوں۔ غائبانہ تعارف ہوا تھا۔ ہم وطن بھی ہیں۔ میں بریلی کا رہنے والا ہوں"۔

یہ باتیں کر کے اور حال احوال پوچھ کر فارق صاحب یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے کہ "آپ تو تھکے ہوئے ہوں گے۔ آرام کیجئے۔ میں آپ کے برابر والے کمرے میں ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے بتائیے گا۔ دن میں ایک بجے ہم لوگ ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔ کھانا ہوسٹل سے آجاتا ہے۔ کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ انشاءاللہ اچھا وقت گذرے گا"۔

ڈاکٹر فارق صاحب مجھے پہلی ہی نظر میں صورت شکل اور انداز گفتگو سے فرشتہ معلوم ہوئے۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ، میانہ قد، دُبلا پتلا جسم، چہرے پر مختصر سی سیاہ رنگ کی داڑھی، علی گڑھ کٹ کے پاجامے اور قمیص میں ملبوس، جب وہ میرے کمرے میں دستک دے کر داخل ہوئے تو میں اُن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اُن کا لباس نہایت صاف ستھرا تھا، اُن کے جوتے میں چمک تھی، اُن کا نورانی چہرہ داڑھی کے باوجود نہایت شگفتہ و شاداب تھا۔ غرض اُن کی ہر چیز سے باقاعدگی اور صفائی ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے اپنی جھلک اس طرح مجھے دکھائی۔ چند منٹ کھڑے کھڑے باتیں کیں، اور پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوپہر کو ایک بجے کے قریب وہ پھر میرے پاس آئے، اور کہا "عبادت صاحب! کھانا حاضر ہے۔ میرے کمرے میں آئیے۔ میں نے وہیں کھانا لگوا دیا ہے"۔

میں اُن کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ چھوٹی سی ایک چمکتی ہوئی میز پر صاف ستھرے برتنوں میں کھانا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے اُن کے کمرے میں بھی بڑی باقاعدگی نظر

آئی۔ اُن کا بستر نہایت صاف ستھرا تھا اُس پر ایک خوبصورت بیڈ کور پڑا ہوا تھا۔ دو تین کرسیاں اس کے سامنے پڑی تھیں جو آئینے کی طرح چمک رہی تھیں اور جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اِن کو بار بار رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا ہے۔ ایک کونے میں چائے کے برتن اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نیچے فرش پر اسپرٹ سے گرم ہونے والا ہیٹر رکھا تھا جس پر ایک کیتلی چمک رہی تھی۔ فارق صاحب اس ہیٹر کو جلا کر خود چائے بناتے تھے۔

فارِق صاحب نے مجھے اپنے اس کمرے میں بڑی محبت سے بٹھایا، اور کہا "آئیے، کھانا حاضر ہے"۔ ہم نے اپنی اپنی کرسیاں میز کے قریب کرلیں اور کھانا شروع کیا۔ ہوسٹل سے آیا ہوا کھانا نہایت سادہ تھا۔ دو گھری پلیٹوں میں سالن اور ایک بڑی پلیٹ میں چپاتیاں۔

فارِق صاحب ہوسٹل کے کھانے سے خوش نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگے "ہوسٹلوں کا کھانا کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ بس زندہ رہنے کے لئے مجبوراً کھایا جاتا ہے۔ میں نے کئی سال تک علی گڑھ میں ہوسٹل کا کھانا کھایا ہے۔ وہ تو بالکل ہی کھانے کے قابل نہیں ہوتا تھا عربک کالج ہوسٹل کا کھانا اس کے مقابلے میں بہتر ہے۔ لیکن روٹی یہاں بہت خراب ہوتی ہے"۔

یہ کہہ کر انھوں نے ایک روٹی اُٹھائی، اُس پر لگی ہوئی آٹے کی خُشکی کو جھاڑا، اور کہا "دیکھئے عبادت صاحب! یہ روٹی بھلا کھانے کے قابل ہے؟ لیکن کیا کیا جائے۔ مجبوراً اس کو کھانا پڑتا ہے۔ چند روز میں آپ بھی اس کے عادی ہو جائیں گے"۔

میں چُپ چاپ کھانا کھاتا رہا، اور فارِق صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

کھانے کے بعد فارِق صاحب نے اپنے ہیٹر پر بڑی نفاست سے چائے بنائی، اور یہ کہہ کر مجھے پلائی کہ "آپ تھکے ہوئے ہیں۔ چائے ضرور پی لیجئے"۔

صاف ستھرے چمکتے ہوئے برتنوں میں نہایت لطیف قسم کی چائے میں نے بڑے شوق سے پی، اور دیر تک فارِق صاحب کی نفاست پسندی کی داد دیتا رہا۔

اُس زمانے میں عربی کے شعبے میں طالب علم کم ہوتے تھے۔ چار پانچ سے زیادہ تعداد نہیں تھی۔ اس لئے فارِق صاحب کبھی تو نیچے کلاس روم میں جاکر انہیں لکچر دیتے تھے، اور

کبھی انہیں اوپر اپنے کمرے ہی میں بُلا لیتے تھے، لیکن کمرے میں بھی اُن کے لیکچر کے مخصوص انداز میں فرق نہیں آتا تھا۔ لہک لہک کر پڑھاتے تھے، اور طالب علم ہمہ تن گوش رہتے تھے۔

میں کئی سال عربک کالج، ہوسٹل میں ڈاکٹر فارق صاحب کے ساتھ رہا، اور مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا۔ اِس طرح اُن کی شخصیت کے بعض نہایت ہی دلچسپ اور دلکش پہلو میرے سامنے آئے۔

فارق صاحب نہایت کم آمیز انسان تھے۔ زیادہ لوگوں سے مِلتے جُلتے نہیں تھے۔ اُن کی کوئی سوشل لائف نہیں تھی۔ دن رات پڑھنے اور لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر اُن کی کتابیں سلیقے سے رکھی رہتی تھیں۔ ایک طرف سادے کاغذ اُن کے سامنے رکھے رہتے تھے، اور وہ اُن پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ بلا مبالغہ سیکڑوں ہزاروں صفحے اُنہوں نے لِکھ ڈالے تھے، اور چند سال میں اُن کی کئی کتابیں شائع ہو گئی تھیں۔ اِن کتابوں کے موضوعات اسلامی علوم کے مختلف پہلو تھے۔ انہوں نے گذشتہ تیس سال میں بے شمار مقالات اِن موضوعات پر لکھے جو مختلف دینی رسائل میں شائع ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، اور حضرت عثمان غنیؓ کے نادر و نایاب خطوط مُرتب کئے اور کتابی صورت میں اُن کو نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ ان کے علاوہ خلفائے راشدین کے عہد کی بعض اہم شخصیات کی سوانح بھی لکھیں۔ غرض انہوں نے علمی دُنیا میں بڑے اہم کارنامے انجام دیئے۔

ڈاکٹر فارق دین دار آدمی تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ لیکن دین کے معاملے میں اُن کے خیالات انقلابی تھے۔ وہ اجتہاد کے قائل تھے۔ اِس لئے نئی نئی باتیں سوچتے تھے، اور دینی معاملات کو نئے زاویوں سے دیکھنا اُن کے پیشِ نظر تھا۔ بعض علماء نے اُن کے اِن انقلابی خیالات سے اختلاف بھی کیا، اور اُن کے خلاف مضامین بھی لکھے لیکن فارق صاحب سچے آدمی تھے، اور اپنے خیالات کے اظہار میں کبھی مصلحت کو پیشِ نظر نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے انقلابی خیالات میں تبدیلی نہیں کی اور اپنی ساری زندگی اسی قسم کے علمی کاموں میں گذار دی، اور ایسی اعلےٰ درجے کی تصانیف پیش کیں جن کو دینی

علوم پر کام کرنے والے کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

فارق صاحب اپنی تصانیف کی طباعت میں صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کاپیاں خود پڑھتے تھے اور اُن کی تصحیح خود کرتے تھے۔ بلکہ عربی متن کی کتابت تک خود کر دیتے تھے۔ ایک دن میں اُن کے ہاں گیا تو دیکھا کہ اُن کی میز پر لیتھو سے چھپنے والے پیلے رنگ کے کاغذ پڑے ہوئے ہیں۔

میں نے اُن سے پوچھا "ایسے کاغذ تو کاتب استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے پاس یہ کاغذ کہاں سے آئے؟"

کہنے لگے "یہ کاتب صاحب ہی کے کاغذ ہیں۔ وہ عربی کی کتابت صحیح نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں نے اُن سے کہا کہ عربی متن کی کتابت میں خود کردوں گا تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ یہ کاغذ میں نے اُن سے منگوائے ہیں اب میں کتابت بھی کر رہا ہوں۔"

میں یہ سب کچھ سن کر حیران ہوا، اور یہ سوچتا رہا کہ یہ شخص کتنی محنت کر سکتا ہے۔ کتابت تک کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایسے پروفیسر اور عالم اس زمانے میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے۔

فارق صاحب اپنی ان علمی مصروفیات کے باوجود لوگوں سے اچھی طرح ملتے تھے، اور اُن کو خاصا وقت دیتے تھے۔ کوئی بھی اُن سے ملنے آئے تو اس کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، اور اس کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ مصروف ہیں۔ اس کی خاطر مدارات بھی کرتے تھے، اس کو نہایت سلیقے اور گرم جوشی سے چائے بھی پلاتے تھے اور دیر تک اس سے باتیں کرتے تھے۔ اُن کا اخلاق بہت بلند تھا۔ وہ لوگوں کی مدد بھی بہت کرتے تھے۔ میں تو اُن سے اکثر باتیں کرکے اُن کا قیمتی وقت ضائع کرتا تھا۔ اُن کی باتیں میرے علم میں اضافے کا باعث بنتی تھیں، اور میں اُن سے باتیں کرکے ایک عجب طرح کی مسرت بھی محسوس کرتا تھا۔ اُن کی شفقت اور محبت مجھ سے بے پایاں تھی۔

ڈاکٹر فارق صاحب نہایت سادہ اور بڑی ہی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے۔ دُنیاوی معاملات سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ زندگی کے مادّی پہلوؤں سے اُنہیں

کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُنہوں نے اپنی ضرورتوں کو محدود کرلیا تھا۔ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے انسان کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، بس اِن کے علاوہ اُن کی کوئی ضرورت نہیں تھی اُن کے پاس ایک کمرہ تھا جس کو وہ بہت صاف ستھرا رکھتے تھے۔ اسی میں سوتے تھے، اسی میں کام کرتے تھے۔ اسی میں اپنے مہمانوں کو ٹھہراتے تھے۔ پروفیسر عبدالعزیز المیمنی صاحب، جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر تھے، اور فارِق صاحب کے اُستاد تھے، وہ بھی جب دِلّی آتے تھے تو اُن کے ساتھ اینگلو عربک کالج کے اسی کمرے میں قیام کرتے تھے۔ میری مُلاقات اُن سے فارِق صاحب کے اسی کمرے میں ہوئی، اور میں نے اُن کے علم سے استفادہ کیا۔ ان کے پاس صرف دو تین شیروانیاں تھیں جن کو وہ بڑے سلیقے سے زیب تن کرتے تھے۔ چند کرتے اور پاجامے تھے جو کبھی میلے نہیں ہوتے تھے۔ دو تین جوتے تھے جو ہمیشہ چمکتے رہتے تھے۔ جیب میں دو رومال رکھتے تھے۔ ایک ہاتھ اور چہرے کو صاف کرنے کے لئے، دوسرا جوتوں کی گرد کو جھاڑنے اور چمکانے کے لئے۔ اُن کے کمرے میں اسپرٹ سے چلنے والا ایک ہیٹر (اسٹو) تھا جس پر وہ چائے بناتے تھے: بجلی کا ایک پنکھا تھا جس کو کبھی کبھی ہی استعمال کرتے تھے۔

کہتے تھے "پنکھا چلانے سے انسان کا معدہ خراب ہوجاتا ہے، اور اُس کو اس پنکھے سے تازہ ہوا بھی نہیں ملتی۔ یہ تازہ ہوا کو اندر آنے سے روکتا ہے۔ بس ایک ہی طرح کی ہوا اس سے کمرے میں گھومتی رہتی ہے۔ اور یہ ہوا انسانی صحت کے لئے مضر ہے کیونکہ پنکھا اس کو کثیف بنا دیتا ہے۔"

میں اکثر اُن کی یہ باتیں سُن کر محظوظ ہوتا تھا، اور کبھی کبھی اُنہیں چھیڑتا بھی تھا۔ تھوڑی سی بے تکلفی جو اُن کے ساتھ تھی، اُس نے مجھے کسی قدر گستاخ بنا دیا تھا۔ لیکن فارِق صاحب کبھی میری اِن باتوں کو محسوس نہیں کرتے تھے، بگڑتے اور ناراض نہیں ہوتے تھے اور کبھی بُرا نہیں مانتے تھے۔

ایک دِن عجب واقعہ ہوا۔

فارق صاحب کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔اس کھڑکی میں سے ہوا تو آتی تھی لیکن اوپر ہی اوپر سے گذر جاتی تھی۔کُرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کو کم لگتی تھی۔کم از کم فارق صاحب کا خیال یہی تھا۔بجلی کا پنکھا چلانے کے وہ قائل نہیں تھے۔اس لئے کھڑکی میں سے آنے والی ہَوا سے مُستفید ہونے کی مختلف ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ اُنہوں نے چارپائی تو دروازے کے سامنے ڈالی، اس پر بستر لگایا۔ بستر پر آئل کلاتھ کا بیڈ کور بچھایا۔اپنی چھوٹی سی میز اس چارپائی پر رکھی۔اس کے سامنے اپنی کُرسی لگائی، اور اس پر بیٹھ کر معمول کے مطابق لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ کھڑکی سے آنے والی ہَوا، اوپر ہی اوپر نہ گذر جائے۔ وہ ذرا اونچائی پر بیٹھ کر اس سے مُستفید ہو سکیں۔گرمیوں کا زمانہ تھا۔اس لئے انہیں ہوا کی زیادہ ضرورت تھی۔

اُس زمانے میں میرے عزیز دوست آغا حسن عابدی میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔وہ کسی کام سے برآمدے میں نکلے، اور انہوں نے فارق صاحب کے کمرے کا یہ منظر دیکھا، بہت محظوظ ہوئے۔ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے، اور کہنے لگے "جلدی سے باہر آؤ اور ایک دلچسپ منظر دیکھو، فرش پر چارپائی، چارپائی پر بستر، بستر پر آئل کلاتھ، آئل کلاتھ پر میز، میز کے سامنے کُرسی، کُرسی پر آدمی۔ تم نے یہ منظر کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔جلدی سے آ کر دیکھ لو۔"

میں یہ سُن کر باہر نکلا۔آغا حسن کے ساتھ فارق صاحب کے کمرے کے سامنے گیا۔چک اُٹھائی اندر داخل ہوا۔واقعی فارق صاحب چارپائی پر میز کرسی رکھے ہوئے، اپنے لکھنے کے کام میں مصروف تھے۔

میں نے اس پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔صرف یہ کہا کہ "فارق صاحب! آج کمرے کی سیٹنگ کیسے بدل گئی؟"

فارق صاحب بولے "صاحب! گرمی نے پریشان کر رکھا ہے۔حبس بھی بہت ہے۔ ہوا اس چھوٹی سی کھڑکی میں سے آتی ضرور ہے لیکن بالا ہی بالا گذر جاتی ہے۔جسم کو نہیں لگتی۔آپ جانتے ہیں بجلی کا پنکھا میں استعمال نہیں کرتا۔اس لئے سوچا کہ ذرا اونچائی پر بیٹھ

کر کام کروں تاکہ ہوا لگتی رہے۔ خیال آیا کیوں نہ چارپائی سے فائدہ اُٹھاؤں اور اس پر چھوٹی سی میز اور کُرسی رکھ کر اطمینان سے بیٹھ کر کام کروں۔ ہوا بھی لگتی رہے اور کام بھی ہوتا رہے!

اُن کے اس منصوبے کی تفصیل سُن کر میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا، اور کہا "آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔ تازہ ہوا سے مستفید ہونے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا"۔

فارق صاحب داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے۔

پھر میں نے بات بنائی اور کہا "اُن سے ملئے۔ یہ میرے عزیز دوست آغا حسن عابدی ہیں۔ حبیب بینک کے افسر ہیں۔ میرے ہاں مہمان ہیں۔ سوچا اِن سے آپ کی مُلاقات کراؤں۔ اسی لئے اس وقت آپ کے کمرے میں حاضر ہوا"۔

فارق صاحب نے یہ سُن کر آغا حسن سے مصافحہ کیا، اور کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تشریف رکھئے، میں آپ کے لئے چائے بناتا ہوں"۔

چنانچہ اُنھوں نے اپنے اسپرٹ کے ہیٹر اسٹو، پر چائے بنائی، اور چند منٹ میں چمکتے ہوئے برتنوں میں چائے ہمارے سامنے رکھی۔

اور ہم لوگ چائے پیتے رہے اور دیر تک فارق صاحب سے دلچسپ باتیں کرتے رہے۔

جب ہم لوگ اجازت لے کر وہاں سے رُخصت ہوئے تو فارق صاحب پھر چارپائی پر چڑھ کر میز کرسی پر بیٹھ گئے اور لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا۔

اُن کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

ڈاکٹر فارق صاحب بڑے ہی سادہ اور معصوم آدمی تھے، اور اس سادگی اور معصومیت کے باعث اُن سے بعض عجیب و غریب حرکات سرزد بھی ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے عجیب و غریب ہونے کا احساس انہیں بالکل نہیں ہوتا تھا۔ برخلاف اس کے وہ اپنی اس طرح کی تمام باتوں کو معمول کے مطابق اور مفید سمجھتے تھے۔

تقسیم ہند سے قبل کا زمانہ دلّی میں بڑا ہی پُر آشوب تھا۔ اس زمانے میں آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی محاذ آرائی اپنے شباب

پر تھی۔ اینگلو عربک کالج اُس زمانے میں مسلم لیگ کا قلعہ تھا کیونکہ قائداعظم محمد علی جناح اُس کے سرپرست اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب اس کے صدر تھے۔ تقریباً روزانہ مسلم لیگ کے جلسے کالج ہال میں ہوتے رہتے تھے۔ لیکن فارق صاحب کو ان سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اخبار نہیں پڑھتے تھے۔ کہتے تھے اخبار پڑھ کر طبیعت پر خراب اثر ہوتا ہے۔ جلسے جلوسوں سے بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اُنہیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ دوسری جنگ عظیم کس منزل میں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جاپان پر ایٹم بم پھینک دیا گیا ہے۔ انہیں اس کی بھی خبر نہیں تھی کہ ہندوستان میں سیاسی معاملات کو سلجھانے کے لئے ایک کیبنٹ مشن آیا ہوا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزش اور رسّہ کشی سے بھی وہ بے خبر تھے۔ بس اُن کی دُنیا تو اس کمرے تک محدود تھی جس میں وہ رہتے تھے اور لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔

پاکستان کی تحریک اس زمانے میں اپنے شباب پر تھی، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرح ہمارا اینگلو عربک کالج بھی اس تحریک کا گڑھ تھا۔ متعصب ہندو جماعتوں کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی، اور اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ اس کالج پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ ایسا کرنے کے لئے ہندوؤں کی کوششیں مہینوں تک جاری رہیں اور کالج کے آس پاس فسادات کی آگ بھڑکتی رہی۔

ایک دن کئی گھنٹے تک گولیاں چلتی رہیں تو ہم لوگ خاصے پریشان ہوئے۔ اساتذہ اور طالب علم اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے، اور آپس میں یہ مشورہ کرنے لگے کہ اگر کالج پر حملہ ہو تو اپنا دفاع کس طرح کیا جائے۔ ہر شخص اپنی اپنی تجویزیں پیش کرنے لگا تو فارق صاحب بولے۔

صاحب! آپ لوگ صبر سے کام لیجیے۔ اطمینان سے بیٹھے رہئے۔ ہتھیار تو آپ کے پاس ہیں نہیں۔ لیکن موٹی موٹی ضخیم کتابیں تو ہیں۔ جب ہندو حملہ کریں تو آپ ان کتابوں سے کام لیجیے، اور ان سے ہندوؤں کو ماریئے۔ کتابوں کا ایک مصرف یہ بھی تو

ہو سکتا ہے"۔

فارِق صاحب کی یہ معصومانہ باتیں سُن کر لوگوں نے زوردار قہقہے لگائے۔ اُن کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ کوئی شخص بھی اپنی ہنسی کو ضبط نہیں کر سکتا تھا۔

غرض اس طرح کی معصومیت سے بھرپور باتیں فارق صاحب اکثر کرتے تھے، اور اُن کی اِن باتوں میں کوئی تصنّع نہیں تھا، کسی قسم کی بناوٹ نہیں تھی۔ جو لہر بھی اُن کے دل و دماغ میں اٹھتی تھی، وہ برملا اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ اس اظہار میں اُن کے ہاں سنجیدگی کا رنگ و آہنگ ہوتا تھا۔ وہ ایسی باتیں صرف تفننِ طبع کے طور پر نہیں کرتے تھے۔ اُن کا مزاج ہی یہی تھا۔ بات یہ ہے کہ دُنیا انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ دنیاوی معاملات کو وہ سمجھتے بھی نہیں تھے۔ اُن کی ذہنی کیفیت بالکل بچّوں کی سی تھی، اور واقعی وہ ادھیڑ عمر کو پہنچنے کے باوجود بالکل بچّے تھے۔

ڈاکٹر فارق صاحب کو صرف پاک صاف رہنے اور اپنی ہر چیز کو صاف ستھرا رکھنے کا شوق تھا۔ گرد مٹی اور گندگی کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ خاصا وقت اُن کا صفائی کرنے میں گذرتا تھا۔ ہر چیز کو بس رگڑتے رہتے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے ایک نوکر بھی رکھ لیا تھا۔ عام طور پر وہ چھوٹے بچّوں کو نوکر رکھتے تھے۔ اُن کو پڑھاتے بھی تھے، اور اُن سے صفائی کا کام بھی لیتے تھے۔ چھوٹے بچّوں کے ساتھ سختی سے پیش آنا اُن کا مزاج تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بچّے صرف سختی سے ٹھیک رہتے ہیں۔

ایک دن میں اُن کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ سات آٹھ سال کا ایک بچّہ، جس کو انہوں نے ملازم رکھ لیا تھا، کونے میں دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے ساکت و صامت کھڑا ہے۔

میں اس منظر کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اس لئے فارِق صاحب سے پوچھا "یہ لڑکا کونے میں دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے کیوں کھڑا ہے"؟

فارق صاحب نے کہا "میں نے اس کو سزا دی ہے۔ یہ بڑا ہی شریر لڑکا ہے"۔

میں نے پوچھا "ہوا کیا"؟

کہنے لگے "عبادت صاحب! یہ بڑا بدمعاش لڑکا ہے۔ کام ٹھیک سے نہیں کرتا۔

کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ وقت ضائع کرتا ہے"۔

یہ سُن کر مجھے ہنسی آگئی۔ لڑکے پر ترس بھی آیا۔ لیکن میں چُپ رہا۔ پھر سوچا کہ بیگ صاحب کو بُلا کر لاؤں۔ اُنہیں یہ منظر دکھاؤں۔ وہی اس بچے کو اس عذاب سے نجات دلا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں بیگ صاحب کے پاس گیا۔ انہیں یہ کہانی سُنائی، اور اُن سے کہا کہ "آپ میرے ساتھ چل کر اس منظر کو دیکھ لیجیئے"۔

وہ میرے ساتھ آئے۔ لڑکا ابھی تک کونے میں کھڑا تھا۔ انہوں نے یہ منظر دیکھا، اور اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فارق صاحب سے پوچھا "یہ بچہ کونے میں کیوں کھڑا ہے"؟

فارق صاحب نے پھر کہا "یہ بڑا بدمعاش لڑکا ہے۔ کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ میں نے اس کو سزا دی ہے"۔

بیگ صاحب نے یہ سُن کر ایک قہقہہ لگایا اور کہا "فارق صاحب! یہ بچہ کھلونوں سے نہیں کھیلے گا تو اور کیا کرے گا؟ اس کے تو کھیلنے کے دن ہیں۔ اس عمر میں تو بچے کو کھلونوں سے ضرور کھیلنا چاہیئے"۔

فارق صاحب چُپ رہے۔ نفسیات کے پروفیسر کے سامنے کیا بولتے!

پھر بیگ صاحب نے اس بچے سے کہا "جا میاں! تو میرے ہاں جا۔ سعداللہ کے ساتھ تھوڑی دیر کھیل کے واپس آ۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔ کل میں تجھے بہت سے کھلونے لاکے دوں گا۔ اُن سے خوب کھیلنا"۔

وہ لڑکا بھمبیری ہوگیا۔ کمرے سے باہر نکلا اور بیگ صاحب کے ہاں چلا گیا۔

بیگ صاحب تھوڑی دیر فارق صاحب کے پاس بیٹھے اور کہا "اُس کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ اگر یہ کھیلے گا نہیں تو کام بھی نہیں کرے گا"۔

فارق صاحب نے بیگ صاحب کے سامنے سپر ڈال دی۔ بات اُن کی سمجھ میں آئی۔ لیکن انہوں نے اتنا ضرور کہا "بیگ صاحب! آپ نے سعداللہ کو تو برباد کیا ہی ہے۔ اس لڑکے کو بھی برباد کر دیں گے"۔

بیگ صاحب نے یہ سُن کر پھر ایک قہقہہ لگایا، اور فارق صاحب کے پاس سے یہ

کہہ کر رخصت ہو گئے کہ "یہ لڑکا جب واپس آئے تو اس سے کچھ نہ کہئے گا۔ جُرم تو میں نے کیا ہے۔ اس میں اس بچّے کا کوئی قصور نہیں۔ اگر یہ بچّہ کھیلے گا نہیں تو کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس کی نشو ونما نہیں ہو گی۔ انسانی نفسیات بہت ہی پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہے۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ بیگ صاحب نے چند منٹ میں انہیں شیشے میں اُتارا۔ فارق صاحب کا رویّہ بھی قدرے بدل گیا۔

ڈاکٹر فارق صاحب کوئی چھ سات سال ہمارے ساتھ اینگلو عربک کالج میں رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ دہلی یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے یونیورسٹی پروفیسر اور صدر شعبہ ہو گئے۔ اب اُن کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ انتظامی معاملات میں بھی اُنہیں اُلجھنا پڑا۔ میٹنگوں میں بھی خاصا وقت ضائع کرنا پڑا۔ فارق صاحب اس قسم کے کاموں کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن بہر حال پروفیسر کو یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ فارق صاحب نے اِن فرائض کو احسن طریقے سے انجام دیا، اور اُن کی صدارت میں اس شعبے نے اچھی خاصی ترقی کی۔ اس زمانے میں کچھ عرصے کے لئے وہ مصر بھی گئے اور وہاں انہوں نے بعض اہم علمی کام کئے۔ مصر سے واپس آ کر وہ اپنے علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہے اور ایسے علمی کارنامے انجام دیئے جن کو بین الاقوامی سطح پر پسند کیا گیا۔ اُن کی شہرت اِن کی وجہ سے تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد میں تو پاکستان آ گیا لیکن فارق صاحب لُٹ پٹ کر دِلّی ہی میں رہے۔ اُن کے خاندان کے بیشتر افراد پاکستان آ گئے تھے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ کبھی پاکستان آئے بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سفر سے بہت گھبراتے تھے، اور ہندوستان سے پاکستان آنے کے لئے جو صعوبتیں اُٹھانی پڑتی تھیں، اُن کو برداشت کرنے کی اُن میں سکت نہیں تھی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی یونیورسٹی کے کیولری لائنز کے مکان میں گذار دیا۔

میں موسمِ گرما کی تعطیلات میں جب بھی لاہور سے دِلّی جاتا تھا، تو اُن کے ساتھ اسی مکان میں ٹھہرتا تھا۔ اور مجھے فارق صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ کی وجہ سے گھر کا سا آرام ملتا تھا۔

یہ مکان انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا اچھا خاصا کشادہ مکان تھا، اور فارق صاحب نے اس پرانے مکان کو بھی ایسا صاف ستھرا رکھا تھا کہ اُس میں میرا دل لگتا تھا۔ فارق صاحب سے چھیڑ چھاڑ بھی رہتی تھی۔ دلچسپ باتیں بھی ہوتی تھیں۔ اُن کی بیگم فیروزہ صاحبہ مزے دار کھانے بھی پکاتی تھیں۔ میری بیوی سے اُن کی دوستی تھی، اس لئے وہ ان کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اہتمام کرتی تھیں۔ سلیقہ شعاری اُن پر ختم تھی۔ وہ بڑی ہی مخلص اور مہمان نواز خاتون ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں سلامت رکھے!

سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ جتنے ہندوستانی پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی، ہم لوگ فارق صاحب سے لے لیتے تھے، اور اس طرح دیارِ غیر میں کچھ عرصے کے لئے رئیس ہو جاتے تھے، اور دِلّی میں خوب خریداری کرتے تھے۔

فارق صاحب کا حساب بینک میں نہیں تھا۔ وہ اپنے پیسے نوٹوں کی شکل میں اپنی موٹی موٹی کتابوں میں رکھتے تھے۔

میں جب بھی دِلّی جاتا تو فارق صاحب سے کہتا "آپ کی کتابوں میں جتنے نوٹ رکھے ہوئے ہیں نکال دیجئے مجھے کئی ہزار روپے کی ضرورت ہے"۔

اور فارق صاحب اپنی کتابوں کو ٹٹولتے اور کئی ہزار روپے کے نوٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیتے تھے۔ مجھے جتنی ضرورت ہوتی تھی میں لے لیتا تھا۔ حساب فارق صاحب رکھتے تھے۔ اس کے بدلے میں جو رقم وہ اپنے عزیزوں کو پاکستان میں بھیجنا چاہتے تھے میں لاہور واپس آکر اُن کی ہدایت پر بھیج دیا کرتا تھا۔ میں حساب رکھنے کا عادی نہیں اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ میں فارق صاحب کا کتنا مقروض ہوں۔ حساب تو انہوں نے بھی نہیں رکھا ہوگا۔ خیر، ہمارے درمیان جو خلوص اور محبت ہے، اُس کے پیشِ نظر اللہ تعالےٰ مجھے اور انہیں دونوں کو معاف کر دے گا۔

ڈاکٹر فارق صاحب میرے ساتھ تو بریشم کی طرح نرم تھے اور میری بے تکلفی کو بھی برداشت کر لیتے تھے لیکن ویسے اُن کے مزاج میں سختی خاصی تھی، اور وہ اپنے طالب علموں، بچوں اور نوکروں کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ جب میں سختی کے یہ

مناظر دیکھتا تھا تو یہ سوچتا تھا کہ شاید عربی اور اسلامی علوم کے پروفیسر مزاج کے اعتبار سے ہوتے ہی سخت ہیں۔ لیکن فارق صاحب کے مزاج میں یہ سختی درحقیقت کچھ اصولوں کی وجہ سے تھی جن کو وہ کبھی بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے مزاج کے اعتبار سے وہ آئیڈیلسٹ تھے، اور ہر اُس شخص کو اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے جن کا اُن کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا تعلق تھا۔

چند سال ہوئے میں کسی سمینار میں شرکت کی غرض سے دِلّی گیا۔ جن پتھ ہوٹل میں ٹھہرا۔ سمینار سے فرُصت ملی تو سوچا دہلی یونیورسٹی چلوں اور فارق صاحب سے مل کر پُرانی یادوں کو تازہ کروں۔ چنانچہ میں نے اُن کے ایک شاگرد اور رفیق کار نثار احمدؐ فاروقی کو ساتھ لیا، اور اُن کے پاس دہلی یونیورسٹی میں کیولری لائنز پہنچ گیا۔ میں نے فارق صاحب کو پہلے اطلاع کردی تھی۔ اس لئے وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے گھنٹی بجائی تو فارق صاحب خود باہر آئے۔

کہنے لگے "آپ نے بہت دیر کردی۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں"۔

میں نے کہا "سمینار میں کچھ مصروفیت تھی۔ اس لئے یہاں پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔ نئی دِلّی سے وائس ریگل لاج کا فاصلہ بھی خاصا ہے۔ دہلی میں ٹریفک کا حال بھی بہت خراب ہوگیا ہے۔ ایک بجے جن پتھ سے چلے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ یہاں تک پہنچنے میں لگ گیا"۔

یہ سُن کر فارق صاحب نے ہماری معذرت قبول کرلی۔ بڑی محبت اور تپاک سے اندر لے گئے۔ جہاں کھُلی جگہ پر وہ کام کر رہے تھے وہاں ہمیں بٹھایا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ کئی سال کے بعد مُلاقات ہوئی۔ مجھے وہ کچھ کمزور سے نظر آئے۔ داڑھی کے بال اب بالکل سفید ہوگئے تھے، اور اُن کا رنگ زرد تھا۔

میں نے پوچھا "آپ کی طبیعت کیسی ہے"؟

کہنے لگے "اچھا ہوں۔ زیادہ وقت کام میں گذارتا ہوں۔ گھر سے باہر کم نکلتا ہوں۔ لڑکے بچر کے لئے یہیں گھر پر آجاتے ہیں۔ یہیں اُن کو پڑھا دیتا ہوں۔ چلنا پھرنا بالکل مفقود ہے۔ اس لئے معدہ خراب رہتا ہے۔ دن کا کھانا میں نے چھوڑ دیا ہے۔ کھانا کھالوں تو کام خاطر

خواہ نہیں ہوتا۔ اس لئے دن کو کچھ نہیں کھاتا۔ صرف رات کو تھوڑا سا کھانا کھالیتا ہوں۔"
پھر تھوڑی دیر رُک کر بولے۔ "لیکن آپ کے لئے کھانا تیار ہے۔ آپ کی بھابھی نے نہ جانے کیا کیا کچھ پکا کر رکھا ہے۔ آپ کھانا کھا لیجیئے۔ میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔"
میں نے کہا "آپ ہمارے ساتھ بیٹھ تو جائیے۔"
کہنے لگے "ساتھ بیٹھوں گا تو کچھ نہ کچھ کھالوں گا۔ نثار احمد فاروقی آپ کا ساتھ دیں گے۔ ویسے آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اُن سے خوش نہیں ہوں۔ یہ میرے شعبے میں ہیں لیکن ہفتوں ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ عربی اور اسلامیات کی بجائے اُردو ادب پر کام کرتے ہیں۔ گذشتہ چند سال میں انہوں نے اپنے مضمون عربی اور اسلامیات پر کچھ نہیں لکھا۔"
میں نے کہا "یہ تو صحیح ہے لیکن اُردو ادب پر انہوں نے اچھا کام کیا ہے۔ اب آپ کی نگرانی میں عربی اور اسلامیات پر بھی کام کریں گے۔"
ہم لوگ یہ باتیں کر کے کھانے کے کمرے میں گئے۔ طرح طرح کے کھانے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے مزے لے لے کر فیروزہ بھابھی کا پکایا ہوا کھانا کھایا۔ لیکن فارق صاحب ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ ہم کھانا کھاتے رہے، وہ باہر کام کرتے رہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ پھر اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئے، اور باتیں کرنے لگے۔ کوئی ایک گھنٹہ اُن کے پاس بیٹھ کر اور احباب کی شکائتیں وغیرہ سُن کر نئی دِلّی اپنے ہوٹل میں واپس آئے۔ دوسرے دن میں لاہور واپس آگیا۔

ڈاکٹر فارق صاحب نے کوئی چالیس سال اینگلو عربک کالج اور دہلی یونیورسٹی میں گذارے۔ اور اپنے مضمون میں ایسا کام کیا جس کو بین الاقوامی شہرت ملی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک پروفیسر عالم اور محقق تھے شب و روز کام میں لگے رہتے تھے۔ یہی اُن کی دُنیا تھی۔ دُنیا سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

چند سال ہوتے ڈاکٹر فارق صاحب دہلی یونیورسٹی کی پروفیسری سے ریٹائر ہوئے، اور اب یہ سُنا ہے کہ وہ علی گڑھ چلے گئے ہیں۔ وہاں مکان بنا لیا ہے، اور وہیں اپنے علمی کاموں

میں مصروف رہتے ہیں۔ کسی سے ملتے نہیں۔ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ کہیں آتے جاتے نہیں۔ سفر نہیں کرتے۔ کسی کو خط نہیں لکھتے۔ علی گڑھ سے کوئی آتا ہے تو اُن کی خیریت مل جاتی ہے، اور کسی حد تک اُن کی علمی مصروفیات کا علم ہو جاتا ہے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر خورشید احمد فارق اسلامی تاریخ اور عربی زبان وادب کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے اسلامی تاریخ کے قدیم ماخذوں کو جس طرح کھنگالا ہے، اور اُن سے استفادہ کر کے اپنی تحقیقی تحریروں سے تاریخ اسلام کے جن خلاؤں کو پُر کیا ہے، وہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخِ اسلام کا ہر مؤرخ اُن کی گراں قدر تحقیقات سے استفادہ کئے بغیر اس سفر کو طے نہیں کر سکتا۔ انہوں نے جس محنت اور جاں فشانی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے خطوط تلاش کر کے مرتب کئے ہیں، وہ اُن کا سب سے بڑا علمی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ ان کے علاوہ "اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں" "تاریخ ردّہ (حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد کی بغاوتوں اور فوجی سرگرمیوں کی تاریخ) اور "قرن اول کا ایک مُدبّر مختار ابن عُبید ثقفی"، فارق صاحب کی ایسی تصانیف ہیں جن سے خُلفائے راشدین کے عہد سے مُتعلق بے شمار تاریخی، تہذیبی اور دینی حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اور اُن کی یہ تصانیف اور ان کے علاوہ بے شمار مقالات کو دیکھ کر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اسلامی علوم کا ایک بحرِ ذخار ہیں۔ اُن کی نظر بڑی ہی دور رس ہے۔ اُن کا مزاج تجزیاتی ہے، اور وہ نہایت سچے، مخلص اور روشن خیال مُورخ اسلام ہیں، اور یہ اُن کی ایسی خوبیاں ہیں جو بہت کم مُصنّفوں کو نصیب ہوتی ہیں۔

لیکن فارق صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک کھرے اور صاف گو آدمی، ایک بلند اخلاق انسان اور ایک سچے اور مخلص دوست ہیں۔ دُنیاوی معاملات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں، مادی چیزوں سے اُنہیں کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ دُھن کے پورے اور کام کے پکّے ہیں، اور دوستوں سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔

یہ فارق صاحب کی نظرِ عنایت ہے کہ وہ اتنی دور ایک غیر ملک میں رہنے کے باوجود مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں، اور اُن کی شفقت اور محبت مجھ پر ہمیشہ بے پایاں اور بے اندازہ رہی ہے۔ اس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں کہ جب بھی اُن کی کوئی تصنیف شائع ہوتی ہے تو سب سے پہلے مجھے بھیجتے ہیں اور اُس پر اس قسم کے الفاظ کے گہر ہائے آب دار سے مجھے مالامال کرتے ہیں:-

"صدیقِ باصفا عبادت صاحب کی خدمت میں، ارمغانِ محبت"

خورشید احمد فارق

ایئر کموڈور

سیّد انعام الحق

اینگلو عربک کالج میں مجھے پہنچے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک صاحب مجھے ایسے نظر آئے جو سوٹ میں ملبوس، اکیڈمک گاؤن پہنے ہوئے سائیکل پر تیزی سے کہیں جا رہے تھے۔ دوسرے دن دیکھا کہ وہ کالج کے برآمدے میں کھڑے ہوئے، اسٹینڈ پر لگے ہوئے اخبار پڑھ رہے ہیں۔

ابھی تک اُن سے میرا تعارف نہیں ہوا تھا۔ اس لئے میں نے کالج کے لائبریرین عبدالمعید صاحب سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟"

اُنھوں نے جواب دیا "یہ انگریزی کے اُستاد سیّد انعام الحق ہیں۔ اُستاد اچھے ہیں۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فاضل ہیں۔ پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی کے خاص شاگردوں میں ہیں۔"

میں نے کہا "لیکن کچھ بے چین اور لااُبالی سے معلوم ہوتے ہیں۔"

معید صاحب نے کہا "آپ کا خیال صحیح ہے۔ ان کے مزاج میں تلوّن بہت ہے۔ ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھتے۔ کچھ بے چین اور پریشان سے رہتے ہیں۔ اکثر گاؤن میں ملبوس اور سائیکل پر سوار نظر آتے ہیں۔"

چند روز بعد وہ مجھے سٹاف روم میں ملے تو اُن سے تعارف ہوا۔ انہوں نے پہلی ہی مُلاقات میں سب کچھ اپنے متعلق بتا دیا۔

دراز قامت، کتابی چہرہ، سُرخ سفید رنگ، گول چہرہ، داڑھی مونچھیں صاف، سر پر چھوٹے چھوٹے بھورے بال، آنکھوں میں چمک، نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس۔

یہ تھے سیّد انعام الحق۔ میں اُن کی شخصیت سے مُتاثر ہوا۔ چند منٹ اُن سے باتیں کیں۔ اپنے بارے میں بتایا۔ اُن سے کچھ معلومات حاصل کیں۔ باتیں کرتے ہوئے اُن پر اچانک بے چینی سی طاری ہوئی۔ کہنے لگے "مجھے ذرا کوچہ چیلاں تک جانا ہے۔ جلدی میں ہوں۔ انشاء اللہ کل مُفصّل ملاقات ہوگی۔

یہ کہہ کر وہ باہر کھڑی ہوئی اپنی سائیکل پر بیٹھے، اور تیزی سے چلے گئے۔

میں انہیں دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے دن وہ میرے کمرے میں آئے۔ اینگلو عربک کالج میگزین کا ایک شمارہ میری طرف بڑھایا، اور کہا "یہ کالج کا میگزین ہے۔ میں اس کے انگریزی سیکشن کا نگراں ہوں۔ اُردو سیکشن کے نگراں اب آپ ہوں گے۔ آپ اس رسالے کو پڑھیئے۔ اس کا معیار ذرا بلند کرنے کی ضرورت ہے۔"

میں نے رسالہ اُن سے لیا، اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

انعام الحق کہنے لگے "اِس میں میری کچھ انگریزی نظمیں شائع ہوئی ہیں آپ اِن کو پڑھ کر اپنی رائے دیجیئے گا۔"

میں نے اُن کے سامنے ہی اِن نظموں کو پڑھا، اور یہ نظمیں مجھے اچھی لگیں۔ اس لیئے میں نے کہا۔ "ماشاء اللہ! آپ کی نظمیں تو خوب ہیں۔ اُن کو پڑھ کر جی خوش ہوا۔"

کہنے لگے "آپ کی محبت اور حُسنِ نظر ہے، ورنہ جو کچھ میں لکھتا ہوں، اُس میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک اُن کے اندر ایک لہر سی اُٹھی۔ کہنے لگے "بس میں چلتا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہیں۔ اب تو آپ کالج میں ہیں۔ آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیر کی طرح میرے کمرے سے باہر نکلے، اور سائیکل پر تیزی سے کہیں چلے گئے۔ میں انہیں پھر دیکھتا رہ گیا۔

ان دو ملاقاتوں میں مجھے اُن کی مُتلوّن مزاجی کا اندازہ ہو گیا۔ لیکن میں نے اپنے دِل کو اس طرح سمجھایا کہ یہ تو شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کو متلوّن مزاج تو ہونا ہی چاہیئے۔ ویسے وہ مجھے قابل آدمی معلوم ہوئے۔ اُن کی انگریزی مجھے اچھی نظر آئی، اور ان کے ادبی مزاج کا میں قائل ہو گیا۔

دو تین مہینے تک اُن سے تقریباً روزانہ مختصر سی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پھر موسم گرما کی تعطیلات ہو گئیں۔ میں لکھنؤ چلا گیا۔ انعام صاحب دِلی میں رہے۔ تعطیلات کے بعد جب میں واپس دِلی آیا تو دیکھا کہ انعام صاحب میں بڑی نمایاں تبدیلی رونما واقع ہو چکی ہے۔ اب اُن کے چہرے پر داڑھی نظر آنے لگی تھی۔ نظریں نیچی رہنے لگی تھیں۔ سوٹ کی جگہ شیروانی اور پاجامے نے لے لی تھی، سر پر اُونچی دیوار کی ٹوپی کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اب وہ ہر ایک کو بھائی کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔

اُن سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا "انعام صاحب! یہ انقلاب کیسے ہوا؟"

کہنے لگے "بھائی عبادت! اللہ تعالےٰ نے فضل کیا۔ میں تبلیغی جماعت میں شامل ہو گیا ہوں۔ مجھے روشنی مل گئی ہے، اور میں زندگی کے حقائق کو سمجھنے لگا ہوں"۔

میں نے کہا "یہ تو واقعی ایک انقلاب ہے جس نے آپ کی شخصیت کو بالکل بدل دیا ہے"۔

کہنے لگے "یہ تبلیغی جماعت مولوی الیاس صاحب نے قائم کی ہے، اور اُن کی سربراہی میں اس جماعت نے بڑے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ دِلی کے آس پاس، خصوصاً میوات کے علاقے میں ان لوگوں نے عوام کو صحیح مسلمان بنایا ہے، اور دین کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ آج کل اس کے سربراہ بھائی وہاب صاحب ہیں۔ میری اُن سے ملاقات ہوئی تو مجھ پر اُن کا بہت اثر ہوا، اور میں اپنے آپ کو صحیح مسلمان بنانے کے لئے اور دین کی خِدمت کی خاطر اس جماعت میں شامل ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ کا کرم ہے، ورنہ میں اس قابل

نہیں ہوں۔ بڑا گناہ گار آدمی ہوں۔ اب میں تبلیغ سے وابستہ ہوں اور اُن کے تبلیغی اجتماعات میں شریک ہونے لگا ہوں۔ آپ بھی اس میں شامل ہو جائیے، اور دین کی خدمت کیجیے۔"

میں نے کہا "بھائی انعام! مجھے تھوڑا سا وقت دیجیے۔ میں ذرا اس کا جائزہ لے لوں اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لوں۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

انعام صاحب چپ رہے۔ کچھ نہیں بولے۔

چند روز کے بعد ایک دن تبلیغی جماعت کے سربراہ بھائی وہاب صاحب بھی کالج میں آئے۔ انعام صاحب نے اُن کا تعارف کروایا۔ وہ ایک جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ باتیں بھی بہت اچھی کرتے تھے میں اُن سے متاثر ہوا، اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اُن کی جماعت میں مجھے شامل ہو جانا چاہیئے، چنانچہ میں نے اس فیصلے سے بھائی انعام اور بھائی وہاب کو مطلع کر دیا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔

ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ بھائی انعام ایک دن میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے کہ "ہفتے کی رات کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں تبلیغی اجتماع ہے۔ میری اور بھائی وہاب دونوں کی یہ خواہش ہے کہ آپ اس اجتماع میں شریک ہوں، اور رات ہمارے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں گذاریں۔"

میں اس اجتماع میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گیا، اور شام کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پہنچ گیا۔ میں نے پہلے اُن کے مزار پر حاضری دی، فاتحہ پڑھی، اور پھر تبلیغی اجتماع میں جا کر پیچھے بیٹھ گیا۔ عشاء کے بعد تمام حاضرین نے چنے کی دال اور تندوری روٹی کھائی، اور اس کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ جلسے میں کوئی خاص تقریریں نہیں ہوئیں۔ صرف کچھ لوگوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کی وضاحت کی، اور فجر کے وقت تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ میں شب بیداری کا عادی نہیں ہوں۔ اس لئے رات بے چینی سے گذاری۔ صبح کو وہاں سے رخصت ہوا، اور اپنی جائے قیام پر واپس آیا۔

چلتے وقت بھائی انعام نے کہا "آپ کو اللہ تعالےٰ نے روشنی عطا فرمائی ہے۔ ان اجتماعات میں ضرور شریک ہوتے رہیئے۔ شریک ہونے کا ثواب بہت ہے۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ ! ضرور شریک ہوتا رہوں گا"۔

چند مہینے کے بعد رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔ میں نے معمول کے مطابق روزے رکھے۔ رمضان کے آخری دنوں میں ایک دن بھائی انعام میرے پاس آئے اور کہا "کل جامع مسجد میں تبلیغی اجتماع ہے۔ روزہ وہیں افطار کیجیے، اور اجتماع میں شریک ہونے کی سعادت بھی حاصل کیجیے۔ میری اور بھائی ذہاب دونوں کی یہ خواہش ہے"۔

میں نے وعدہ کرلیا، اور افطار سے کچھ پہلے جامع مسجد پہنچ گیا۔ روزہ افطار کیا۔ افطاری میں ایک کھجور، ذراسی چنے کی دال ایک، دو پھلکیاں تھیں۔ میں نے ان سے افطار کیا، اور کئی گلاس پانی پیا اور اجتماع میں شریک ہوگیا۔ جلسے کا وہی ماحول تھا جو میں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ میں دیکھا تھا۔ کئی گھنٹے اس اجتماع میں شریک رہا دس بجے کے قریب مجھے بہت بھوک لگی تو میں نے بھائی انعام سے کہا کہ "میں افطار کے وقت ہی کھانا کھانے کا عادی ہوں۔ میرا کھانا کالج میں رکھا ہوگا۔ اب مجھے جانا چاہیئے"۔

بھائی انعام کہنے لگے "آؤ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہارے لئے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے نیچے اُترے، اور ایک دکان سے دو عدد ڈبل روٹیاں خریدیں۔ ایک کو خود کھانا شروع کیا، دوسری مجھے دی اور کہا "لو، بھئی ! ڈبل روٹی کھاؤ"۔

میں نے کہا "میں اس طرح ڈبل روٹی نہیں کھا سکتا۔ میں کالج جاؤں گا، اور کھانا کھاؤں گا"۔

یہ انعام صاحب کی قلندری کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس واقعے کے بعد میں نے انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا، مجھے یہ سب کچھ صحیح نہیں معلوم ہوا، اور پھر میں اُن کے ساتھ کبھی کسی اجتماع میں نہیں گیا۔ کیونکہ ابھی میں درویشی اور قلندری کی اُس منزل سے ہم کنار نہیں ہوا تھا، جس پر بھائی انعام پہنچ چکے تھے۔

قیام پاکستان سے چند مہینے پہلے بھائی انعام کالج کی پروفیسری کو خیرباد کہہ کر

ایئر فورس میں چلے گئے، اور سرگودھا میں اُن کی پوسٹنگ ہوگئی۔

میں جب دِلّی میں لُٹ پٹ کر لاہور پہنچا، اور اورینٹل کالج میں میرا تقرر ہوگیا تو ایک دن بھائی انعام اپنی فوجی وردی میں ملبوس اورینٹل کالج میں مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے، اور بڑی محبت سے ملے۔ پھر کئی سال تک وہ تقریباً ہر مہینے میرے پاس آتے رہے، اور فوج میں جو کارنامے اُنہوں نے انجام دیئے، اُس کی تفصیل مجھے سُناتے رہے۔

اُن کی داڑھی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، اور اُن کی متلون مزاجی روز بروز بڑھتی رہی۔

ایک دن اُنہوں نے یہ واقعہ بھی سُنایا کہ فوج کے ایک انگریز افسر نے اُن سے جواب طلب کیا کیونکہ وہ اپنی ڈیوٹی کو چھوڑ کر نماز پڑھنے چلے گئے تھے۔ لیکن ایئر مارشل اصغر خاں نے اپنے ذاتی اثر سے معاملے کو رفع دفع کروا دیا۔

اس کے بعد وہ کئی سال کے بعد آئے تو فوجی وردی کی جگہ شلوار اور شیروانی میں ملبوس تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگے "میں ایئر فورس سے ریٹائر ہو گیا ہوں لیکن مجھے پنجاب میں لائبریریز کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا گیا ہے، اور اب میں لاہور ہی میں رہوں گا۔ صوبے بھر کی لائبریریاں میری نگرانی میں کام کریں گی۔ ابھی مجھے دفتر نہیں مِلا۔ اسٹاف بھی نہیں دیا گیا۔ فی الحال میں پنجاب پبلک لائبریری میں بیٹھ کر کام کروں گا۔"

میں نے کہا "مجھے تمہارے اس تقرر سے خوشی ہوئی۔ پنجاب میں لائبریریوں کی دیکھ بھال اور اُن کے لئے منصوبہ بندی ایک اہم قومی خدمت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کام کو بخیر و خوبی انجام دو گے۔"

خُدا جانے وہ اس کام میں کس حد تک کامیاب ہوئے، اور پنجاب میں لائبریریوں کے لئے اُنہوں نے کیا کام کیا۔ اس کی تفصیل انہوں نے مجھے کبھی بتائی نہیں۔

البتہ ایک کام اُن کی نگرانی میں ضرور ہوا، وہ یہ کہ حکومت پنجاب نے باغِ جناح کی ایک بہت بڑی عمارت میں، جہاں کبھی جم خانہ کلب تھا، اُنہوں نے ایک بہت بڑی لائبریری کے قیام کا ڈول ڈالا جو اب قائد اعظم لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ کروڑوں روپے اس عمارت کی مرمت اور زیبائش و آرائش پر حکومت نے صرف کئے، اور

کروڑوں روپے کی امریکی اور برطانوی کتابیں اس لائبریری کے لئے منگوائی گئیں۔ بڑے سلیقے سے اِن کتابوں کو اس لائبریری کی زینت بنایا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ مشرقی اور اسلامی علوم کی کتابیں اس میں جمع نہیں کی گئیں۔ کیونکہ انعام صاحب عربی، فارسی اور اُردو کی پُرانی کتابوں کو اس لائبریری کے لئے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ دیدہ زیب جلدوں کی امریکی کتابوں کو جمع کرنا اُن کے پیشِ نظر تھا۔

میں نے جب اس لائبریری میں یہ کمی محسوس کی تو ایک دن اُن سے کہا کہ "آپ اسلامیات، عربی، فارسی اُردو کے پروفیسروں کی ذاتی لائبریریوں کو اس لائبریری کے لئے حاصل کیجئے۔ اِن سے اس لائبریری میں اسلامی اور مشرقی علوم میں تحقیق کا ماحول پیدا ہوگا، اور کشاں کشاں اسکالرز اِن سے استفادہ کرنے کے لئے یہاں آئیں گے۔ پروفیسر سیّد وزیر الحسن عابدی کی لائبریری کو تو آپ ضرور حاصل کر لیجئے۔ عابدی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کی بیگم اس لائبریری کو کہیں محفوظ کروانا چاہتی ہیں۔

چنانچہ وہ میرے کہنے پر ایک دن پروفیسر صاحب مرحوم کی لائبریری کو دیکھنے کے لئے اُن کی جائے قیام پر سمن آباد آئے بھی، اور اس کا جائزہ لے کر میرے غریب خانے پر بھی آئے اور کہا "یہ کتابیں تو بہت پُرانی ہیں، اور خستہ حالت میں ہیں۔ میں تو دیدہ زیب جلدوں کی نئی کتابیں اس لائبریری میں جمع کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں بھائی انعام کو کس طرح سمجھاتا کہ ان پُرانی کتابوں کی کیا اہمیت ہے، اور مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے جو بیش بہا خزانے عابدی صاحب نے زندگی بھر اپنا تن پیٹ کاٹ کر جمع کئے ہیں وہ ریسرز چ کے لئے کتنے مفید ہو سکتے ہیں!

انعام صاحب کے اس رویّے سے بددل ہو کر اس بیش بہا خزانے کو میں نے حکیم محمد سعید صاحب کی ہمدرد یونیورسٹی میں محفوظ کروا دیا۔ لیکن اِس کے بعد انعام صاحب سے مِلنے کے لئے کبھی قائدِاعظم لائبریری نہیں گیا۔

سُنا ہے کہ قائدِ اعظم لائبریری انعام صاحب کی نگرانی میں تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اور وہ اس کی روز افزوں ترقی سے بہت خوش ہیں۔ کیونکہ خوشنما جلدوں کی قیمتی امریکی اور برطانوی کتابوں کا اُس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور اُن پر لاکھوں روپے ہر سال خرچ ہو رہے ہیں۔

میں انعام صاحب اور اُن کی لائبریری کے لئے یہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ انہیں لائبریری کے صحیح تصوّر سے آشنا کرے اور وہ صحیح راستے پر گام زن ہوں!

ایں دعا از من و از جُملہ جہاں آمین باد

اُستاد سبطی

اُستاد سبطی اینگلو عربک کالج دہلی کی ایک اہم شخصیت تھے۔ اُن کی ملازمت تو معمولی سی تھی لیکن اُستادوں اور طالب علموں کے دلوں میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ وہ اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں ہیڈ باورچی تھے۔ اُن کا زیادہ وقت باورچی خانے میں گذرتا تھا۔ دن بھر قسم قسم کے لذیذ کھانے پکاتے تھے، اور بڑے پیار اور محبت سے ہوسٹل میں رہنے والے طالب علموں کو کھلاتے تھے۔ صبح کو وہ چائے بناتے تھے اور مکھن لگے ہوئے دو دو توس اور ایک ایک مگ چائے سے ہر طالب علم کو ناشتہ کرواتے تھے۔ دوپہر کو بارہ بجے کے قریب بکری کے گوشت کا سالن اور چپاتیاں طالب علموں کو دیتے تھے، اور اسی طرح رات کو بھی تازہ سالن اور چپاتیاں تیار کرتے تھے۔ ہفتے کی شام کو بریانی اور قورمہ پکاتے تھے، اور یہ کھانا اتنا لذیذ ہوتا تھا کہ دُور دُور تک اُن کے اس کھانے کی دھوم تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ صرف سترہ روپے مہینہ اس پر خرچ آتا تھا۔

اُستاد چھوٹے قد کے آدمی تھے لیکن جسم گٹھا ہوا تھا۔ سر کے بال اُڑ گئے تھے، چہرہ ڈھل گیا تھا لیکن خوب صحت مند معلوم ہوتے تھے۔ روزانہ شیو کرنا اُن کی عادت تھی، علی گڑھ کے مخصوص پاجامے اور کُرتے میں ملبوس رہتے تھے۔ سردیوں میں معمولی سا سویٹر یا مرزائی پہن لیتے تھے۔ اُن کے اس لباس میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ہوسٹل کے ایک چھوٹے

سے کمرے میں اُن کا بسیرا تھا، لیکن دن بھر یہ کمرہ بند رہتا تھا کیونکہ وہ دن بھر کھانے پکانے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کمرہ رات کو صرف سونے کے لئے تھا۔

اُستاد مغربی یوپی کے کسی شہر، غالباً مُراد آباد یا امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن بچپن ہی میں دِلّی آ گئے تھے۔ عربک کالج ہوسٹل میں اُنہیں ملازمت مل گئی تھی۔ دِلّی کی چھاپ اُن پر ایسی تھی کہ دلّی کے کارخنداری لہجے میں باتیں کرتے تھے۔ اور عربک کالج ہوسٹل میں اپنے فرائض انجام دینے کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اُن کی زندگی عربک کالج تک محدود تھی۔ باہر کم نکلتے تھے۔ راشن تک اپنے ماتحتوں سے منگوا لیتے تھے۔ صرف اس کو سنبھال کر رکھنا، اور سلیقے اور قاعدے سے استعمال کرنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔

وہ بڑے منتظم آدمی تھے۔ ہوسٹل کا سارا کاروبار اُن کی وجہ سے صحیح طور پر چلتا تھا۔ کہنے کو تو وہ ہیڈ باورچی تھے لیکن سارے ہوسٹل کی دیکھ بھال وہ خود کرتے تھے طالب علموں کے ساتھ اُن کا رابطہ تھا اور وہ اُن کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے، اس لئے طالب علم اُن کی ہر بات مانتے تھے۔ جو کہہ دیتے تھے، اس پر عمل ہوتا تھا۔ اُن کے زمانے میں ہوسٹل میں کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ کبھی کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ کبھی کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ طالب علموں کا وہ خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ اُن کا کوئی مہمان آ جائے تو اس کو بھی وہ اپنا مہمان سمجھتے تھے، اور اس کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے تھے۔

اُستاد کے زمانے میں کئی سال تک میں عربک کالج ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ رہا۔ لیکن اس زمانے میں وہ صرف دو دفعہ چند منٹ کے لئے مجھ سے ملنے آئے۔ ان دو ملاقاتوں کا مقصد صرف بعض معاملات میں مشورہ کرنا تھا۔ کھڑے کھڑے بات کی اور چلے گئے۔ نہ میں نے نہ انہیں کبھی بُلایا نہ وہ خود آئے۔ کاروبار معمول کے مطابق خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ ملنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

اُن کا معمول یہ تھا کہ صبح کو وہ کھانا پکاتے تھے گیارہ بجے کے قریب ڈائننگ ہال

یں آجاتے تھے، اور کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔ بارہ بجے کھانا شروع ہو جاتا تھا۔ وہ ہر طالب علم کو خود نکال کر کھانا دیتے تھے۔ اُن کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ طالب علم ڈائننگ ہال میں کھانا کھائیں۔ لیکن اگر کوئی طالب علم کسی وجہ سے ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھانا نہ کھانا چاہے تو وہ اس کو کمرے میں لے جانے کی اجازت دے دیتے تھے۔ سہ پہر کو وہ شام کا کھانا پکاتے تھے، اور مغرب کے بعد ڈائننگ ہال میں آکر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔ کھانے کا وقت ہو جاتا تھا تو وہ ہر طالب علم کو کھانا نکال کر دیتے تھے۔ رات کو تقریباً نو بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اگر کوئی طالب علم وقت پر نہ آتا تو وہ اُس کا کھانا محفوظ کر لیتے تھے۔ جب وہ باہر سے واپس آتا تو اُستاد سے کھانا لے لیتا تھا۔ کبھی کسی طالب علم کو پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ اُستاد سخت گیر نہیں تھے۔ کسی طالب علم کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ یہ اُن کی خوش انتظامی کا کرشمہ تھا۔

اُستاد سبطی صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ اعتماد الدولہ کی تعمیر کی ہوئی سنگِ سرخ کی جو مسجد اینگلو عربک کالج کے اندر تھی، اُس میں پانچوں وقت کی نماز با جماعت پڑھتے تھے۔ مسجد کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی اُن کے ایماء پر مسجد میں وعظ کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ اکثر وہ نذر و نیاز کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ اُن کی اس دین داری کا یہ اثر ہوا تھا کہ بیشتر چپراسی اور چوکی دار وغیرہ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے لگے تھے۔

تقریباً تیس سال وہ اینگلو عربک کالج میں رہے، اور طالب علموں کی خدمت کرتے رہے۔ اُن کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ ہفتے کی شب کو وہ جو بریانی اور قورمہ پکاتے تھے، اُس کی نہ صرف دِلّی بلکہ علی گڑھ تک میں دھوم تھی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے کئی طالب علم ہفتے کو اُستاد کے ہاتھ کی پکی ہوئی بریانی کھانے کے لئے دِلّی آجاتے تھے۔ اُستاد عربک کالج کے طالب علموں کے مہمان سمجھ کر اُن کی خاطر مدارات کرتے تھے، اور اتوار کو وہ دِلّی کی سیر کرکے واپس علی گڑھ چلے جاتے تھے۔ اُستاد کو ان مہمانوں کے آنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ وہ مہمانوں کی بڑی عزت کرتے تھے، اور اُن کی خاطر مدارات کرکے خوش ہوتے تھے۔

اس زمانے میں اینگلو عربک کالج تحریک پاکستان کا بہت بڑا مرکز تھا۔ قائداعظم اس کے سرپرست اور نواب زادہ لیاقت علی خاں اس کی گورننگ باڈی کے صدر تھے مسلم لیگ کے بڑے بڑے جلسے اسی کالج میں ہوتے تھے۔ کالج کے پروفیسر، طالب علم اور عملے کے لوگ تحریک پاکستان اور مسلم لیگ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن استاد سبطی کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اپنے فرائض کو خوش اسلوبی اور تن دہی کے ساتھ انجام دینے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ سیاسی جلسوں میں انہوں نے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو متعصب ہندوؤں نے اس کالج کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے، اور کئی دفعہ اس پر حملے کئے۔ دراصل اُن کا منصوبہ پروفیسروں اور طالب علموں کو قتل کرنا اور کالج کی اینٹ سے اینٹ بجانا تھا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دِلّی میں بڑے پیمانے پر فساد کرائے گئے جس کے نتیجے میں ایک قلزم خوں موج زن ہوا۔ سارے شہر میں خوف کی فضا پیدا ہوئی۔ اس افراتفری کی وجہ سے خاصی تعداد میں عربک کالج ہوسٹل کے طالب علم اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جو رہ گئے وہ پریشانی کے عالم میں وقت گذارنے لگے۔

اُستاد سبطی اِن طالب علموں کو ہر وقت تسلّی دیتے تھے اور اُن میں حوصلہ اور ولولہ پیدا کرتے تھے۔ نہ خود گھبراتے تھے نہ لڑکوں کو گھبرانے دیتے تھے۔ کھانا وغیرہ معمول کے مطابق تیار کرتے تھے۔ لیکن اُداسی اور سوگواری کی گھٹائیں اُن پر چھائی رہتی تھیں۔

میں اُن دنوں کالج ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس لئے ایک دن وہ میرے پاس آئے، اور کہنے لگے "میاں! حالات روز بہ روز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے اپنی فکر نہیں۔ طالب علموں اور پروفیسروں کی وجہ سے پریشان رہتا ہوں۔ اگر حملہ ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

میں نے کہا "اُستاد! آپ فکر نہ کیجئے۔ راشن وغیرہ زیادہ سے زیادہ جمع کر لیجئے۔ ہم لوگ غافل نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم لوگوں کو کچھ عرصے کے لئے یہاں سے کہیں اور جانا پڑے"۔

اُستاد سبطی یہ سُن کر بہت اُداس ہوئے اور بولے "کیا مجھے بھی یہاں سے جانا پڑے گا؟ میرا دل تو کالج چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ مجھے تو آپ یہیں رہنے دیجیئے گا۔ میں اسی چار دیواری میں مرنا چاہتا ہوں"۔

میں نے کہا "اُستاد! آپ فکر نہ کیجیئے۔ چلیں گے تو سب ساتھ چلیں گے، اور جب حالات ٹھیک ہوں گے تو پھر واپس آجائیں گے۔ یہ سب کچھ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیئے"۔

چند روز نہیں گذرے تھے کہ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب نے خطرے کے پیش نظر ہم لوگوں کو اپنے ہاں "گل رعنا" میں بُلا لیا۔ مجبوراً ہم لوگ لڑکوں اور پروفیسروں کو لے کر اُن کے ہاں چلے گئے۔ اُستاد سبطی بھی مع اپنے ضروری برتنوں اور راشن کے ساتھ رہے۔

'گُل رعنا' میں ہم لوگوں نے دو تین دن قیام کیا، اور پھر ہم لوگ پُرانے قلعے میں چلے گئے۔ یہاں ہم نے دِلّی کے پریشان حال مسلمانوں کے لئے کیمپ قائم کیا۔ اُستاد سبطی نے یہاں بھی کھانے کا انتظام کیا لیکن یہ کھانا اس کھانے سے بالکل مختلف تھا جو عربک کالج میں پکتا تھا۔ اب اُنہوں نے چینی ڈال کر گیہوں اُبال کر لوگوں کو دینے شروع کئے۔ بے سرو سامانی کا عالم تھا۔ اس لئے سوائے اس کے اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

پرانے قلعے میں ہم سب نے اُس آشوب قیامت کو دیکھا جو دِلّی پر اس زمانے میں مُسلط ہوا تھا۔ اُستاد اس زمانے میں بہت پریشان رہے۔ اس لئے نہیں کہ دِلّی میں قیامت برپا تھی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ہم لوگوں کے لئے اپنے مخصوص انداز کا کھانا نہیں پکا سکتے تھے۔ اور یہ کہ کالج اُن سے چھوٹ گیا تھا۔

کئی ہفتے انہوں نے اسی عالم میں گذارے، اور جب پاکستان کے لئے ریلیں چلنے لگیں تو وہ بھی سب کے ساتھ اُس میں بیٹھ کر پاکستان چلے گئے، اور کئی مہینے تک خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے رہے۔ لیکن اُن کا وہاں دل نہیں لگا۔ چند مہینے کے بعد جب حالات ذرا سنبھلے تو وہ دِلّی واپس آئے، اور مجھ سے کہنے لگے "میاں! مجھے تو آپ اب یہیں کالج میں رہنے دیجیئے۔ میں کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ یہیں مروں گا"۔

میں نے کہا "اُستاد! آپ یہیں رہیئے۔ کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کالج آپ کا کالج ہے۔ سیاسی تبدیلیوں کے نتیجے میں یہاں کی فضا ضرور بدلی ہے لیکن نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنی چاہیئے۔ زندگی میں ایسے تماشے تو بہرحال دیکھنے پڑتے ہیں۔ آپ کے موجود ہونے سے کالج میں رونق رہے گی"۔

پروفیسر مرزا محمود بیگ صاحب اب کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اُستاد کو اپنے دفتر میں بٹھالیا، اور برائے نام اُن کے سُپرد کچھ کام بھی کر دیا۔ اُستاد اس زمانے میں اپنے ہوسٹل اور اس میں رہنے والے طالب علموں کو یاد کرتے تھے۔ لیکن اُن کے طالب علم تو اب تتر بتر ہو گئے تھے، اور کالج ہوسٹل میں ہندو شرنارتھیوں کا بسیرا تھا۔

اِس مسموم ماحول میں اُستاد نے اپنی زندگی کے خاصے دن گُذارے۔ لیکن کالج کو آخر وقت تک نہیں چھوڑا۔ کالج کے در و دیوار سے رابطہ رکھا اور بے شُمار پُرانی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے وہ سُلگتے رہے۔ انہیں ویسے بیگ صاحب کی وجہ سے کالج کے نئے ماحول میں ہر طرح کا آرام تھا، لیکن وہ مخصوص فضا اُن کو نصیب نہیں تھی جس سے قیام پاکستان سے قبل اینگلو عربک کالج پہچانا جاتا تھا۔

وہ اس فضا کو یاد کرتے تھے، در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈالتے تھے، اور جو بھی ملتا تھا، اُس سے کہتے تھے کہ "میاں! اب یہ کالج عربک کالج نہیں ہے، کچھ اور ہے، نہ طالب علم، نہ ہوسٹل، نہ ڈائننگ ہال نہ باورچی خانہ! اس کو کالج کس طرح کہوں؟ وہ کالج تو اب مرحوم ہو چکا ہے"۔

اور اُستاد سبطی کی یہ باتیں سُن کر ہر ایک کا دِل بھر آتا تھا، اور کالج کے در و دیوار تک پر رِقت سی طاری ہو جاتی تھی۔

پروفیسر سی۔ایچ۔فلپس

پروفیسر سی۔ایچ فلپس روایتی قسم کے قدامت پسند انگریز ہونے کے باوجود پاکستانی تھے۔ وہ لندن یونیورسٹی میں اسلامیانِ ہند کی تاریخ کے پروفیسر اور سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے ڈائرکٹر تھے۔ اپنی ملازمت کے آخری زمانے میں لندن یونیورسٹی کے ڈپٹی وائس چانسلر اور پھر وائس چانسلر ہو گئے تھے۔ انتظامی امور کے لئے انہیں خاصا وقت دینا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ برعظیم پاکستان و ہند کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت پر تحقیقی کام کرتے رہتے تھے۔ پاکستان پر اُن کی کتاب اُن چند اہم کتابوں میں سے ہے جو قیام پاکستان کے بعد لندن سے شائع ہوئیں۔ پاکستان کی تحریک اور اسلامیان ہند و پاکستان کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی، اور ان موضوعات پر اُن کے کئی عالمانہ مقالے انگلستان کے تحقیقی جرنلز میں شائع ہو چکے تھے۔ نظریاتی اعتبار سے وہ تحریک پاکستان اور تقسیم ہند کو صحیح سمجھتے تھے، اور اُنھوں نے تحریک پاکستان سے متعلق مواد جمع کرنے کے کام کا بھی منصوبہ بنایا تھا جو جزوی طور پر تکمیل سے ہم کنار بھی ہوا۔

لندن جانے سے قبل میں نے اُن کی کتابیں اور مقالے پڑھے تھے، اور میں اُن کے علمی اور تحقیقی کام سے خاصا متاثر تھا۔ خصوصیت کے ساتھ پاکستان اور مسلمانوں کے

ساتھ انہیں جو دلچسپی تھی، اس نے اُن کی قدرو منزلت میرے دل میں بہت بڑھا دی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے بارے میں میری معلومات ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ لندن یونیورسٹی میں برعظیم پاکستان وہند کی تاریخ کے پروفیسر ہیں اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن کے ڈائرکٹر ہیں۔

جب لندن یونیورسٹی میں اُردو زبان وادب اور تاریخ وثقافت پاکستان کے اُستاد کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا تو اُن سے دفتری قسم کی خط وکتابت ہوئی۔ اور جب میں لندن پہنچا تو مجھے کئی سال تک اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں میں نے اُن کو بہت قریب سے دیکھا، اور میرے دل پر اُن کی باقاعدگی، تہذیب وشائستگی اور علم دوستی کے گہرے نقوش ثبت ہوئے۔

ابھی مجھے لندن میں آئے ہوئے دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ اُن کی سکرٹری مس شین کا ٹیلی فون آیا۔ وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ "میں یہ ٹیلی فون اسکول کے ڈائرکٹر پروفیسر فلپس کی طرف سے کر رہی ہیں۔ وہ آپ کو کافی پر بُلانا چاہتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ آپ ابھی نئے نئے لندن آئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ بہت مصروف ہوں گے۔ لیکن اگر آپ اپنی مصروفیت میں سے تھوڑا سا وقت نکال سکیں اور اُن کے ساتھ کسی وقت کافی کی ایک پیالی پیئیں تو وہ آپ کے ممنون ہوں گے۔ اپنی ڈائری دیکھ کر وقت مجھے بتا دیجیے۔"

میں نے اس کے جواب میں کہا "میں آپ کا اور پروفیسر صاحب کا مُتشکر گُذار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دی۔ مجھے خود اُن سے ملنے کے لئے حاضر ہونا چاہیئے تھا لیکن میں مصروف رہا۔ اس لئے مجھ سے یہ کوتاہی ہوگئی۔ گیارہ بجے میرا لکچر ہوتا ہے۔ میں بارہ بجے کے قریب فارغ ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ مصروف نہ ہوں تو میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

مِس شین نے یہ سُن کر کہا کہ "کل بارہ بجے آپ تشریف لائیے، اور پروفیسر فلپس کے ساتھ کافی پینے کی زحمت گوارا فرمائیے۔ آپ کا انتظار رہے گا۔"

دوسرے دن میں بارہ بجے کے قریب پروفیسر فلپس کے دفتر میں پہنچا۔ مس شین سے ملاقات ہوئی۔ دو تین منٹ اُن سے باتیں کیں۔ انھوں نے میرا حال احوال پوچھا۔ اتنے میں پروفیسر صاحب خود اپنے کمرے سے باہر آگئے، اور مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ صوفے پر بٹھایا اور اپنے مخصوص شیریں اور شائستہ لہجے میں مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

اُنہوں نے دریافت کیا "آپ کب آئے؟ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "میں پرسوں لندن آگیا تھا۔ رالف رسل ایئرپورٹ پر پہنچ گئے تھے۔ اسکول کے سکریٹری کرنل ڈاکٹر موائز بارٹلیٹ COL DR. MOYSE - BARTLET اور مسٹر گیٹ ہاؤس MR. GATE - HOUSE نے ویورلی ہوٹل میں میرے قیام کا انتظام کر دیا تھا، اور مجھے اس کی اطلاع دے دی تھی۔ ایئرپورٹ سے میں رالف کے ساتھ سیدھا وہاں پہنچا، اور وہیں مقیم ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔"

کہنے لگے "مجھے خوشی ہے کہ آپ آرام و اطمینان سے لندن پہنچے اور اب اس شہر میں خوش ہیں، اور یہ کہ اسکول میں پڑھانے کا کام بھی آپ نے شروع کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "آپ حضرات کی مہمان نوازی اور باقاعدگی کی وجہ سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بڑے اطمینان اور آرام سے ہوں۔"

پروفیسر فلپس نے کہا "لندن تاریک سا شہر ہے۔ یہاں تو ہر وقت بادل چھائے رہتے ہیں۔ بارش ہوتی رہتی ہے دھوپ ذرا کم ہی نکلتی ہے۔ فیکٹریوں کا دھواں بھی فضا میں چھایا رہتا ہے۔ آپ کا دل تو یہاں نہیں لگے گا۔ کیونکہ آپ دُنیا کے جس حصّے سے آئے ہیں، وہ تو اپنی دھوپ، گرمی، سرسبزی و شادابی اور صاف شفاف فضا کے لئے مشہور ہے۔ لیکن کچھ عرصے یہاں رہیں گے تو ضرور آپ کا دل لگ جائے گا۔ یہاں آزادی بہت ہے۔ علمی کام کرنے کے لئے لائبریریاں اور میوزیم ہیں۔ پارک اور باغ بھی خاصے ہیں۔ تھیٹر بھی ہیں۔ بیلے وغیرہ بھی ہیں۔ غرض دلچسپیاں یہاں خاصی ہیں۔ آپ یہاں جم کر علمی کام کیجیئے۔ آپ کے لئے یہ بہت اچھا موقع ہے۔ تفریح بھی کرنی چاہیئے۔ یہ بھی ضروری ہے۔"

میں نے کہا "لندن تو مجھے بہت پسند ہے۔ یہ شہر نہ تو زیادہ جدید ہے نہ زیادہ قدیم۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی چند روز ہوئے ہیں لیکن میرا دل یہاں لگ گیا ہے۔ میرے پیش نظر علمی اور تحقیقی کام کے منصوبے بھی ہیں۔ میں قیام لندن سے انشاء اللہ پورا پورا فائدہ اُٹھاؤں گا۔ آپ کے مفید مشوروں کے لئے شکر گذار ہوں"۔

پروفیسر فلپس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ کہنے لگے "لندن کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے، اور روز بروز اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس شہر کے بیشتر علاقے صاف نہیں رہے ہیں۔ گندگی یہاں خاصی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ البتہ آس پاس کے علاقے صاف ستھرے ہیں۔ میں تو اسی وجہ سے لندن کے مضافات میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ ہو سکے تو آپ بھی لندن کے مضافات میں رہیئے"۔

میں اُن کی یہ باتیں چپ چاپ سنتا رہا، اور ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

پھر کہنے لگے "انگلستان کا تعلیمی نظام ابھی تک بہت اچھا ہے۔ اگرچہ امریکیوں نے اس پر شب خون مارا ہے۔ بیشتر تعلیمی ادارے اُن کے زیر اثر ہیں لیکن انگریزوں نے اس کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ اس اعتبار سے لندن اچھی جگہ ہے لیکن آپ آکسفورڈ، کیمبرج ، اڈنبرا، لیڈز، ڈرہم اور اسی طرح کے دوسرے مقامات پر بھی جایئے۔ آپ کو ایسا کرنے سے بہت فائدہ ہوگا"۔

غرض پورے ایک گھنٹے تک پروفیسر فلپس مجھ سے اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔

جب گھڑی کی سوئی ایک پر پہنچی تو انہوں نے کہا "میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے لیکن میری خواہش تھی کہ میں آپ سے ملوں اور باتیں کروں۔ ابھی تو آپ سے بہت سی ملاقاتیں ہوں گی۔ ہم لوگ سینئر کامن روم میں کافی اور چائے کے وقت مل سکتے ہیں۔ میں اکثر وہاں آتا ہوں۔ وہاں چائے اور کافی پیئیں گے اور بے تکلفی سے باتیں کریں گے۔ کبھی کوئی ضرورت ہو، کوئی کام ہو تو بے تکلفی سے میرے پاس دفتر میں آیئے۔ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوگی"۔

میں سمجھ گیا کہ پروفیسر صاحب نے میرے لئے ایک گھنٹے کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس

لئے میں نے یہ کہہ کر اُن سے اجازت لی کہ مَیں کئی سال تک یہاں رہوں گا۔ آپ کی باتوں سے استفادہ اور آپ کے مفید مشوروں پر عمل کروں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ"!

یہ کہہ کر میں اُٹھا۔ پروفیسر صاحب مجھے باہر تک چھوڑنے کے لئے آئے، اور بڑے احترام سے مجھے رخصت کیا۔

پروفیسر فلپس بے حد مصروف انسان تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے مجھے وقت دیا، اور مجھ سے دلچسپ باتیں کیں اور نہایت عزت اور احترام کے ساتھ پیش آئے۔

ایک گھنٹے کی اس مُلاقات نے میرے دل میں اُن کی عظمت کا احساس پیدا کیا، اور میں اُن کی بڑائی کا قائل ہوگیا۔

اس کے بعد لندن کے دورانِ قیام میں اُن سے بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی اُن کے دفتر میں، کبھی کافی اور چائے پر سینئر کامن روم میں، کبھی کھانے پر اسکول کی رِفیکٹری میں اور کبھی برٹش اورینٹلسٹ کی کانفرنسوں میں جو میرے قیام لندن کے زمانے میں آکسفورڈ، کیمبرج، لیڈز، اڈنبرا اور ڈبلن میں منعقد ہوئیں، اور مجھے اُن سے مل کر ایک عجیب طرح کی مسرّت ہوئی۔

ایک دن ہم لوگ اسکول کی رِفیکٹری میں کھانا کھا رہے تھے۔ میری پلیٹ میں کھانے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن پروفیسر صاحب کی پلیٹ میں سلاد کا ایک سبز پتّہ، پانچ سات مٹر کے دانے، دو تین آلو کے ٹکڑے بس اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اور وہ ایک ایک مٹر، آلو اور سلاد کانٹے سے کھا رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ میری متجسّس نگاہوں سے وہ سمجھ گئے کہ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ اتنا کم کھانا کیوں کھاتے ہیں؟

اس لئے وہ خود ہی بولے "آپ کو یقیناً حیرت ہوگی کہ میں لنچ میں اس طرح کا کھانا کیوں کھاتا ہوں؟"

میں نے رسماً کہا "یہ کھانا تو بہت اچھا ہے"۔

کہنے لگے "آپ کے جیسے نوجوانوں کے لئے تو یہ کھانا اچھا نہیں ہے۔ لیکن میرے جیسے بوڑھے آدمی کے لئے اس قسم کا کھانا نہایت مناسب ہے۔ اس کھانے کو کھا کر

طبیعت بوجھل نہیں ہوتی، اور میں شام تک اطمینان سے کام کرسکتا ہوں"۔

میں نے کہا"میں آپ سے سو فی صد اتفاق کرتا ہوں"۔

ایک دن سینئر کامن روم میں کافی کے وقت رش بہت تھا۔ کافی لینے کے لئے قطار بنی ہوئی تھی۔ پروفیسر فلپس میرے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے احتراماً کہا"آپ آگے آجائیے۔ میں آپ کے بعد کافی لوں گا"۔

کہنے لگے "نہیں۔ میں تو کیو میں ہوں" I am in a que میں آپ کے بعد آیا ہوں۔ آپ کے بعد کافی لوں گا۔ یہاں کے آداب یہی ہیں"۔

بس یہ سُن کر چُپ ہو گیا، اور مزید تکلّف نہیں کیا۔

ادب آداب کی بات تو اور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر فلپس کو اپنی بڑائی اور اپنے منصب کی برتری کا احساس بالکل نہیں تھا۔ وہ سب کو برابر سمجھتے تھے۔

ایک دن لندن میں بڑا طوفان تھا۔ بارش ہو رہی تھی، تیز ہوا چل رہی تھی' اولے گر رہے تھے، میں اسکول کے دروازے پر کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اور اسکول کے پورٹر مسٹر جونس کے لطیفوں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ پروفیسر فلپس کی کار سامنے آکر رُکی۔ اُنہوں نے اپنی مخصوص جگہ پر کار کو پارک کیا۔ اپنی برساتی کندھے پر ڈالی، پورٹ فولیوں ہاتھ میں لیا، چھتری بغل میں دبائی، اور تیزی سے بھیگتے ہوئے اسکول میں داخل ہوئے۔

مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو رُکے اور کہا Hello. Dr. Brelvi How do you feel in this aweful weather. (ہیلو، ڈاکٹر بریلوی! اس خوفناک موسم میں آپ کس طرح محسوس کرتے ہیں؟

میں نے کہا I am helpless. Who can control the elements. مجبوری ہے عناصر پر کون قدرت رکھتا ہے"؟

پھر وہ اسکول کے پورٹر مسٹر جونس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "Mr. Jones! Quite a storm outside. "مسٹر جونس! خاصا طوفان ہے"۔

مسٹر جونس نے جواب میں کہا "Yes Sir! Quite a Storm."

(جی ہاں جناب اچھا خاصا طوفان ہے"۔

چند لمحوں میں یہ باتیں کر کے اُنھوں نے اپنی چھتری اور برساتی مسٹر جونس کے حوالے کی، اور لفٹ میں کھڑے ہو کر تیسری منزل پر اپنے دفتر میں پہنچ گئے"۔

اور میں یہ سوچتا رہا کہ اس شخص کے مزاج میں کتنی سادگی، کیسی بذلہ سنجی اور کس درجہ عاجزی اور انکساری ہے۔ اس کو اپنے منصب کی بڑائی کا ذرّہ برابر بھی احساس نہیں۔ وہ چاہتا تو اپنی بھیگی ہوئی تمام چیزیں مسٹر جونس کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا جاتا، اور جونس اِن چیزوں کو اس کے دفتر میں پہنچا دیتے لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا، اور عام استادوں اور طالب علموں کی طرح لدا پھندا اپنے کمرے میں پہنچا۔

انگلستان میں ایک تنظیم ایسوسی ایشن آف برٹش اورینٹلسٹ تھی۔ برطانیہ کی تمام یونیورسٹیوں کے مشرقی علوم کے اساتذہ اس کے ممبر تھے۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ اس کی سالانہ کانفرنسیں مختلف شہروں میں ہوتی تھیں اور خاصی تعداد میں مشرقی علوم سے دلچسپی لینے والے اِن کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس کے مختلف اجلاسوں میں تحقیقی مقالے پڑھے جاتے تھے اور مشرقی علوم کے مسائل پر بحثیں بھی ہوتی تھیں۔

ایک سال اس کانفرنس کے اجلاس کیمبرج یونیورسٹی میں ہوئے۔ اس کے ایک اجلاس میں اس موضوع پر بحث ہوئی کہ موجودہ بدلتے ہوئے حالات میں انگلستان کی یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم کی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ مختلف پروفیسروں اور اسکالروں نے اس سیمینار میں حصّہ لیا، اور بیشتر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اب برطانیہ کی بیشتر نوآبادیاں ختم ہو چکی ہیں، اس لئے برطانیہ کو اِن علوم کے مطالعے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ آخر میں پروفیسر فلپس نے اس موضوع پر نہایت خوبصورت تقریر کی جس میں یہ کہا کہ اس موضوع کا نوآبادیاتی نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ پروفیسروں اور اسکالروں کو خالص اکیڈمک نقطۂ نظر سے اِن پہلوؤں کو دیکھنا چاہیئے"۔ تاریخ کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ علم کو کوئی کسی چیز کا پابند نہیں کر سکتا۔ ہم مشرقی علوم سے دلچسپی لینے والے اکیڈمک بنیادوں پر

مشرقی علوم کی تعلیم و تحقیق کو جاری رکھیں گے۔"

جب وہ یہ تقریر کر کے میرے پاس آکر بیٹھے تو میں نے کہا کہ "آپ کی تقریر بہت ہی خیال انگیز تھی۔ لطف آگیا۔ آپ نے بڑے سلیقے سے مشرقی علوم کی تعلیم و تحقیق کی حمایت کی۔ اس سلسلے میں بنیادی دلیل تو وہی ہے جس کو آپ نے اپنی تقریر میں بُنیاد بنایا۔ نو آبادیاں ختم ہو جائیں لیکن اس کے تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی رشتوں کو تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر، جیسا کہ آپ نے کہا علم کو علم کی حیثیت سے بھی تو حاصل کرنا چاہیئے۔"

کہنے لگے "ادھر کچھ عرصے سے انگلستان میں مشرقی علوم کے مطالعے کی مخالفت ہو رہی ہے۔ لیکن میں ہمیشہ اس کی حمایت کرتا ہوں۔ لوگوں کو سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ و تہذیب انسانی رشتوں سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا مطالعہ تہذیب کی نشانی ہے۔ کامن ویلتھ کی تنظیم کو اسی لئے تو قائم کیا گیا ہے۔"

پروفیسر فلپس عالم آدمی تھے اور انتظامی امور کے ساتھ ساتھ زیادہ وقت علمی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نیچر کے دلدادہ، اور انسانی آرام و آسائش، اور ذہنی و جسمانی آسودگی کو انسان کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے۔ زندگی سے بیزاری اُن کے خیال میں اچھی بات نہیں تھی۔ بعض عالم اور پروفیسر اس کو اہمیت نہیں دیتے۔ پروفیسر فلپس کے نزدیک یہ پہلو بہت اہم تھا۔

میرے قیام لندن کے زمانے میں ایک سال مشرقی علوم کے ماہرین کی کانفرنس جمہوریہ آئرلینڈ کے دارالحکومت ڈبلن میں ہوئی۔ مشہور و معروف ٹرینٹی کالج میں اس کے کئی اجلاس ہوئے۔ ایک اجلاس خالص علمی تھا جس میں انگلستان کی یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے پروفیسروں نے تحقیقی مقالے پڑھے۔ میں بھی اس اجلاس میں شریک ہوا۔ لیکن پروفیسر فلپس اس اجلاس میں نہیں آئے۔ اور مجھے اُن کی کمی محسوس ہوئی۔

دوپہر کو ڈبلن کے ٹرینٹی کالج میں کھانے پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھے تو میں نے اُن سے کہا کہ آج آپ صبح کے اجلاس میں تشریف نہیں لائے۔ مقالے

اعلیٰ معیار کے تھے"۔

پروفیسر فلپس مُسکرائے اور کہا ڈاکٹر بریلوی! آج صبح دھوپ بڑی ہی خوبصورت تھی۔ بالکل ہندوستان اور پاکستان کی سی روشن، چمک دار اور گرم، اُس کو دیکھ کر میری نیت خراب ہوگئی۔ میں نے سوچا، بجائے مقالات کے سشن میں شریک ہونے کے، اس دھوپ سے لُطف اندوز ہونا چاہیئے۔ میں کئی گھنٹے ایک پارک میں بیٹھا، اور میں نے اس دھوپ سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ پھر میں نے ڈبلن کی خوبصورت سڑکوں کی سیر کی۔ بازاروں میں بھی گیا۔ میری طبیعت پر اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ مقالات تو چھپ بھی جائیں گے اور ہم اُن کو پڑھ بھی لیں گے۔ لیکن ایسی دھوپ شاید ڈبلن کے دورانِ قیام میں پھر کبھی نہ نکلے۔ اس لئے میں نے دھوپ میں بیٹھنے اور سڑکوں پر گھومنے کو ترجیح دی اور مقالات کے سشن میں شریک نہ ہو سکا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہونا چاہیئے"۔

میں نے کہا "آپ نے بہت اچھا کیا کہ دھوپ کی روشنی اور گرمی سے اپنے اندر حرارت پیدا کی۔ کاش میں بھی ایسا ہی کرتا!"

یہ بات کہہ کر میں نے اُردو کا یہ شعر ان کے سامنے پڑھا ؎

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اور انگریزی میں اس کا ترجمہ انہیں سنایا۔

پروفیسر صاحب اس شعر کے ترجمے کو سُن کر بہت خوش ہوئے۔

غرض کھانے پر دیر تک پروفیسر فلپس دھوپ کی گرمی اور روشنی کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ باتیں کرتے رہے، اور ہم لوگ اُن کی اس گل افشانیٔ گفتار سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

پروفیسر فلپس ہندوستان پاکستان کی تاریخ و سیاست اور تہذیب و ثقافت کے نامور عالم تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ تحریک پاکستان سے متعلق مسلم لیگ کے تمام کاغذات کسی طرح شائع ہو جائیں تاکہ آئندہ اس موضوع پر لوگوں کو کام کرنے کا موقع ملے چنانچہ

اس کے لئے اُنھوں نے ایک منصوبہ بنایا، اور اس کام میں اُن کی مدد کرنے کے لئے تاریخ کے شعبے میں دو لیکچرار بھی رکھ لئے گئے۔ انھوں نے اِس منصوبے پر کچھ کام بھی کیا لیکن اِس کام میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اس سلسلے میں ان کے ساتھ تعاون نہیں کیا بلکہ اس کو ایک مسئلہ بھی بنا دیا جس کی وجہ سے خاصی تناؤ کی فضا پیدا ہوئی۔ پروفیسر صاحب کو اس کا افسوس ہوا۔ جب بھی ملتے تھے تو اس کا تذکرہ حسرت اور افسوس کے ساتھ کرتے تھے۔

اُن کی ڈائرکٹری اور وائس چانسلری کے زمانے میں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل لینڈ افریکن اسٹڈیز نے بڑی ترقی کی۔ نئے نئے شعبے کھُلے۔ مختلف شعبوں میں کئی کئی پروفیسر مقرر کئے گئے۔ ریسرچ کا کام بھی خاصا ہوا۔ وہ بڑے ہی ambitions آدمی تھے۔ خواب دیکھتے تھے۔ وادئ خیال کو مستانہ طے کرتے تھے، اور ہر خواب اور ہر خیال کو عملی شکل دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ شب و روز کام کرتے تھے۔ ان تھک محنت کرنے کے عادی تھے۔ جفاکشی اُن کا شعار تھا۔ اور وہ اسی کو زندگی سمجھتے تھے۔

انتظامی معاملات کو اُنھوں نے اپنے اس رویّے سے ایک فن بنا دیا تھا۔ ایکڈمک ایڈمنسٹریشن کا اتنا بڑا مزاج داں میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اُن کا انتظامی کام ایک دریائے نرم خرام کی طرح رواں رہتا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کرتے تھے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی اور یہ سب کچھ ایکڈمک اعتبار سے مفید ہوتا تھا۔ وہ اساتذہ کی عزّت کرتے تھے۔ اُن سے برابری کی سطح پر ملتے تھے۔ اُن کا خیال رکھتے تھے۔ اُن کی آزادی کے قائل تھے۔ کسی کو خواہ مخواہ چھیڑتے نہیں تھے۔ کسی سے بلا وجہ اُلجھتے نہیں تھے۔ مختلف شعبوں کو اُنھوں نے پوری طرح آزاد کر رکھا تھا۔ اساتذہ پر وہ پوری طرح بھروسہ کرتے تھے۔ اس لئے اُن کا انتظامی کام بڑی خوش اسلوبی سے چلتا تھا۔ وہ ہر ایک کو خوش رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور اپنے اس عمل سے انھیں خود بھی خوشی ہوتی تھی۔

پروفیسر سر سرل فلپس مزاج کے اعتبار سے ایسے قدامت پرست تھے جس

کو انگریزی میں Conventionist کہا جاتا ہے۔ لیکن جدت پسند اور آزاد خیال لوگوں سے انہیں نفرت نہیں تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ اکیڈمک ماحول میں رنگا رنگ خیالات و نظریات رکھنے والوں سے رونق رہتی ہے۔ ہر اُستاد کو سوچنے اور غور کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے کیونکہ اس طرح علمی اور تعلیمی فضا میں رونق پیدا ہوتی ہے، اور صحت مندی کا دور دورہ ہوتا ہے۔

ایک دن میں اُن کے ساتھ سینئر کامن روم میں کافی پی رہا تھا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی آزادی پر بات چل نکلی۔ اس موضوع کے اصولی پہلوؤں پر وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے "ڈاکٹر بریلوی! آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے اسٹاف میں کئی اساتذہ اشتراکی ہیں۔ لیکن انگلستان میں قدامت پسندانہ سیاسی نظام ہونے کے باوجود، اُن سے کوئی باز پُرس نہیں ہوتی۔ کوئی انہیں پریشان نہیں کرتا۔ میری اطلاع کے مطابق اِن میں سے بعض تو الیکشن میں بھی حِصّہ لے رہے ہیں۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا انحصار اُن کی قابلیت اور صلاحیت پر ہے۔ اکیڈمک ماحول میں اس سے صحت مندی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔"

یہ سُن کر میں نے کہا "انگلستان صحیح معنوں میں آزاد مُلک ہے، اور اساتذہ کو یہاں جو آزادی دی گئی ہے، وہ یقیناً لائقِ ستائش اور قابلِ داد ہے۔ دُنیا کے ایسے ممالک کو اس سے سبق سیکھنا چاہیئے جہاں فکر و خیال پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں، اور جہاں زباں بندی ہے۔"

میرے قیامِ انگلستان کا زمانہ خاصے انتشار اور ہنگامے کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں خاصے ہنگامے ہوئے۔ ڈینی دی ریڈ Danny - the Red. نے جرمنی، فرانس اور انگلستان میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ اس کے نتیجے میں برطانیہ کی بعض یونیورسٹیوں میں بھی طالب علموں کے ہنگامے ہوئے۔ ایک یونیورسٹی میں تو انگلستان کی ملکہ تک کے خلاف مظاہرہ ہوا۔

لیکن لندن یونیورسٹی کے کالج اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز ان

سیاسی ہنگاموں سے محفوظ رہے۔ صرف ایک واقعہ اسکول میں کافی کی قیمت میں ایک پنس کے اضافے پر ضرور ہوا۔ لیکن بائیکاٹ ایک دن سے زیادہ نہ چل سکا کیونکہ پروفیسر فلپس نے فوراً طالب علموں کے مطالبات کو تسلیم کرلیا، اور یہ فیصلہ کیا کہ کافی اور چائے کی قیمت میں ایک دو پنس کا جو اضافہ ہوا ہے، اس سے طالب علم متاثر نہیں ہوں گے۔ اسکول کی انتظامیہ کسی اور فنڈ سے یہ کمی پوری کردے گی۔ طالب علم اس فیصلے سے خوش ہوئے۔ سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔

میں نے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں پانچ چھ سال پروفیسر فلپس کے ساتھ گذارے، اور اس طرح مجھے اُن کی دلکش و دلآویز شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ اُن کی شفقت مجھ پر بے پایاں تھی۔ وہ بہت ہی مصروف انسان تھے لیکن اس کے باوجود مجھے مُلاقاتوں کے لئے وقت دیتے تھے۔ میری اُن کی ملاقاتیں اکثر سینئر کامن روم میں کافی اور چائے پر یا اسکول کی ریفیکٹری میں کھانے پر ہوتی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں وہ میرے ساتھ بے تکلفی سے نہایت مانوس فضا میں مختلف موضوعات پر دلچسپ باتیں کرتے تھے، اور میں اُن کی ان باتوں سے بہت کچھ حاصل کرتا تھا۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "ڈاکٹر بریلوی! آپ لندن میں مستقل طور پر کیوں نہیں رہتے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے برٹش میوزیم، انڈیا آفس اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریریوں میں بہت اچھا کام کیا ہے۔ خاصی تعداد میں اُردو زبان اور برعظیم پاکستان و ہند کی تاریخ و تہذیب پر بعض نادر و نایاب کتابیں آپ نے دریافت کی ہیں۔ اگر آپ اسکول میں مستقل طور پر رہنے کا ارادہ کرلیں تو اور بھی مفید کام کرسکیں گے۔ یہاں کے کتب خانوں میں بہت کچھ ہے۔ ابھی تک کسی نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ یہاں مستقل طور پر رہیئے اور خوب کام کیجئے۔"

میں نے کہا آپ کی تجویز تو بہت مفید ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ میں اپنی یونیورسٹی سے چھٹی لے کر حکومت پاکستان کی اجازت سے یہاں آیا ہوں۔ میرا ایس

جانا ضروری ہے کیونکہ میں نے ان لوگوں سے لندن میں اپنا ٹرم پورا کرکے واپس لاہور جانے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو میں یقیناً مستقل طور پر یہیں رہتا۔"

انہوں نے کہا "آپ کا عذر معقول ہے۔ لیکن اس اسکول کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ آپ کے لئے کھلے رہیں گے۔ آپ جب بھی چاہیں یہاں واپس آسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ!"

افسوس ہے کہ میں پروفیسر فلپس کے اس "آفر" سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ کیونکہ مجھے ایک سال پہلے ہی پنجاب یونیورسٹی نے لاہور واپس بلالیا، اور اردو کی پروفیسری، شعبۂ اردو کی صدارت اور اورینٹل کالج کی پرنسپلی کی مصروفیات نے اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ میں اپنے علمی کاموں کی تکمیل کے لئے لندن جاکر کچھ عرصے کام کروں۔

آن قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

پروفیسر فلپس بڑے ہی شائستہ انسان تھے۔ اپنی بات کہتے تھے لیکن ایسے پہلودار انداز میں کہتے تھے کہ کسی کے جذبات مجروح نہیں ہوتے تھے، اور کسی کے دل کو ٹھیس نہیں لگتی تھی۔

ایوب خاں صاحب کی صدارت کے زمانے میں وہ حکومت پاکستان کی دعوت پر پاکستان آئے، اور کوئی دو ہفتے یہاں گذارے۔ لندن واپس جاکر انہوں نے موجودہ پاکستان کے موضوع پر ایک لیکچر دیا جس میں آمریت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی، تہذیبی اور علمی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

انہوں نے کہا کہ "میں رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں پاکستان گیا۔ بے شمار پارٹیوں میں میں نے دو دو بجے رات تک شرکت کی۔ میں تھک گیا ہوں۔ وہاں رات گئے تک پارٹیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر انہوں نے بڑے سلیقے سے اپنے تجربات بیان کئے۔ آخر میں یونیورسٹیوں کا ذکر بھی کیا، اور بتایا کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں نے بڑے بڑے کیمپس بنالئے ہیں لیکن ان میں سیاسی ہنگامہ آرائیاں بہت ہیں۔ اس لئے انتظامیہ سے یہ کیمپس سنبھلتے نہیں۔ پروفیسروں تک کو پڑھنے لکھنے کا موقع کم ملتا ہے۔ ایک یونیورسٹی

ہیں میں نے تقریر کی اور یہ کہا کہ آپ کے موضوع پر جو نئی کتابیں انگلستان میں شائع ہوئی ہیں، وہ آپ کو بھجوا دی جائیں گی، لیکن باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ پروفیسروں کو انگلستان میں نئی چھپنے والی کتابوں کا پوری طرح علم نہیں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ کتابیں یہاں پہنچتی نہیں"۔

غرض اس طرح اپنے مخصوص پہلو دار انداز میں پروفیسر فلپس نے آمریت کی وجہ سے پیدا ہونے والی مخصوص فضا کا ذکر کیا، اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ دیا لیکن کسی کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔

پروفیسر فلپس پاکستان کے مفاد کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اور میرے قیام لندن کے زمانے میں مطالعۂ پاکستان اور اس کی تدریس و تحقیق کے موضوع پر اکثر مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں اُردو اور مطالعۂ پاکستان کی ایک باقاعدہ پروفیسرشپ قائم ہونی چاہیئے۔ لیکن ہماری بیوروکریسی نے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس لئے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ صرف اُردو کی ایک اوورسیز لیکچرشپ پاکستان اور ہندوستان کے شعبے میں قائم رہی۔

اور اس لیکچرشپ پر بھی ہندوستان کے ارباب اختیار کی نظر تھی، اور اُن کا یہ منصوبہ تھا کہ کسی ہندوستانی اسکالر کا اس پر تقرر ہونا چاہیئے۔ میرے زمانے میں ایک صاحب ڈاکٹر ہیکروال لندن کے ہندوستانی سفارت خانے میں تھے۔ اُنہوں نے ایک دن پروفیسر فلپس کو کھانے پر بُلایا، اور یہ کہا کہ "اُردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اس لئے اس جگہ پر کسی ہندوستانی کو رکھنا چاہیئے"۔ اس سے ہندوستان میں اُردو کو فروغ حاصل ہوگا"۔

پروفیسر فلپس نے اُن کی بات سُن لی، اور کہا کہ "میں اس موضوع پر اپنے رفقاء سے مشورہ کروں گا، اور پھر آپ کو اطلاع دوں گا"۔

دوسرے دن مجھے اسکول میں اُن کا پیغام ملا کہ میرے ساتھ کافی پیجیئے۔ میں کافی پینے کے لئے اُن کے کمرے میں پہنچا تو اُنہوں نے ہندوستانی سفارت خانے کی تجویز کی تفصیل مجھے سُنائی۔

میں نے اُن سے کہا یہ "پاکستان کے خلاف سازش ہے۔ اُردو کے لیکچرار کی یہ پوسٹ پاکستان کی پوسٹ ہے کیونکہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے۔ اس لئے اس پر ہمیشہ کسی پاکستانی اسکالر کا تقرر ہونا چاہیئے۔"

پروفیسر فلپس نے مجھ سے اتفاق کیا، اور میں نے اس سلسلے میں جو دلیل پیش کی تھی، اس کو سراہا اور مجھے یقین دلایا کہ اس پوسٹ پر ہمیشہ کسی پاکستانی کا تقرر کیا جائے گا۔

اس طرح پروفیسر فلپس کی دانش مندی اور پاکستان سے دلچسپی کی بدولت ہندوستان کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اور آج بھی اسکول میں اُردو زبان وادب کے استاد کی یہ جگہ کسی پاکستانی اسکالر کے لئے ہے، اور اس پر تقرر پاکستان کی وزارتِ تعلیمات کے مشورے سے کیا جاتا ہے۔

میں جب لندن میں اپنی ملازمت کی مُدت پورا کرکے لاہور واپس آیا تب بھی پروفیسر صاحب سے میرا رابطہ قائم رہا۔ وہ اکثر مجھے خط لکھتے تھے، اور اسکول کے بارے میں نئی سے نئی معلومات کچھ اس طرح فراہم کرتے تھے جیسے میرا رابطہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ اُن کے ایسے خطوط خاصی تعداد میں میرے پاس محفوظ ہیں۔

صرف دو خطوں کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ایک خط میں اُنھوں نے مجھے یہ اطلاع دی کہ ووبرن اسکوائر Woburn Square کے جس کمرے میں آپ بیٹھتے اور کام کرتے تھے، اُس پر اس کی جگہ اسکول کی ایک اور نئی عمارت تعمیر ہوگئی ہے۔ مجھے اس کی بہت خوشی ہے۔ یقیناً آپ کو بھی خوشی ہوگی۔ لیکن مجھے اس موقع پر اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ قیام لندن کے زمانے میں آپ کو ایک بوسیدہ عمارت میں بیٹھ کر کام کرنا پڑا۔ اب نئی عمارت میں آپ کے تمام رفقاء اطمینان سے بیٹھتے ہیں، اور سکون سے کام کرتے ہیں۔ کاش آپ بھی اس نئی عمارت میں ہوتے۔ آپ کی کمی محسوس کرتا ہوں۔"

دوسرے خط میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر اور اورینٹل کالج کے پرنسپل ہونے پر مجھے مبارک باد دی اور لکھا کہ یہ آپ کا حق تھا۔ حق بہ حق دار رسید۔ میں آپ کو اور پنجاب یونیورسٹی کو اس تقرر پر مبارک باد دیتا ہوں۔

یہ سب کچھ پروفیسر فلپس ہی کر سکتے تھے۔!

پھر جب ۱۹۷۲ء میں اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ منایا گیا، اور اس موقع پر میں نے ایک انٹرنیشنل اورینٹل کانفرنس کا اہتمام کیا تو پروفیسر صاحب نے میری بڑی ہمت افزائی کی۔ مجھے ایک مفصل ذاتی خط لکھا، لندن یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر رالف رسل کو خاص طور پر شرکت کے لئے لندن سے لاہور بھیجا، اور ایک محبت بھرا پیغام بھی ارسال کیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

On behalf of my colleagues here I send greetings to you on the auspicious occasion of 'the centenary of Univerrsity Oriental College, which has done so much to promote the advancement of Oriental learning over the years. We trust that the College will go from strength to strength in the years to come.

It is fitting that part of the college celebrations should take the form of an International Congress of Orientalists, and I should like to take this opportunity of wishing the Congress every success. I am sorry that I cannot be with you.

C. H. Philips
Director,
School of Oriental and African Studies, University of London.

London
30, November 1972

غرض پروفیسر فلیس بڑی محبت کے آدمی تھے۔ شفقت اُن کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ اخلاص کے پُتلے تھے۔ ایک دفعہ کسی سے رابطہ ہو جائے تو وہ اُس کو دوستی میں تبدیل کر لیتے تھے۔ جو لوگ علمی اور تحقیقی کام کرتے تھے اُن کے ساتھ اُن کی دوستی نہایت مضبوط بُنیادوں پر قائم ہو جاتی تھی، اور وہ ہمیشہ اُن کا خیال رکھتے، اور اُن کی مدد کرتے تھے۔ وہ بڑے ہی مُہذّب، شائستہ، مرنجاں مرنج، معاملہ فہم، بُردبار اور انسان دوست آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی اُن سے ایک دفعہ مِلتا تھا، وہ اُن کا گرویدہ اور والا و شیدا ہو جاتا تھا، اور وہ خود اپنے انداز سے یہ ظاہر کرتے تھے جیسے اس کے ساتھ اُن کی برسوں کی شناسائی بلکہ آشنائی ہے۔

○

رالف رسل

یہ تقسیم ہند کے چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔
ایک دن سہ پہر کے وقت میں اینگلو عربک کالج دہلی میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے دوست اور رفیق کار خواجہ احمد فاروقی صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ اُن کے ساتھ ایک ایسے صاحب تھے جو غیر ملکی معلوم ہوتے تھے۔
خواجہ صاحب نے اُن کا تعارف کروایا، اور کہا "اِن سے ملئے۔ اِن کا نام رالف رسل ہے۔ یہ انگریز ہیں۔ اُردو زبان و ادب سے انہیں دلچسپی ہے۔ اُردو اچھی خاصی بول لیتے ہیں، لیکن ابھی زیادہ مشق نہیں ہے۔ اس لئے ذرا جھجکتے ہیں۔"
یہ سُن کر میں نے اُن سے انگریزی میں کہا "GLAD TO SEE YOU"
لیکن جواب اُنہوں نے اُردو میں دیا اور کہا "مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ کا نام سُنا تھا۔ میری بدقسمتی ہے کہ اس سے قبل آپ سے مُلاقات نہیں ہوئی۔ میں چند مہینے سے دِلّی میں ہوں۔ زبان سیکھنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا ہوں۔ میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ اسکول نے اُردو بولنے کی مشق کرنے کے لئے مجھے چند مہینے کی چھٹی دی ہے اور یہاں بھیجا ہے۔ میرا مقصد آپ حضرات سے استفادہ کرنا ہے۔ چند مہینے آپ کے ساتھ گذارنا

چاہتا ہوں۔ میں آپ سے اُردو سیکھوں گا۔"

میں نے کہا "بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو اُردو سے دلچسپی ہے، اور زبان بولنے کی مشق کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ہم لوگ ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔"

رالف نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ!"

وہ کوئی ایک گھنٹہ میرے پاس ٹھہرے۔ میں نے اس عرصے میں چائے منگوائی، ہم لوگ چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ جب وہ مغرب کے وقت رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا "کل رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھایئے۔ کھانا کھائیں گے اور باتیں کریں گے۔"

وہ کہنے لگے "میں انشاء اللہ کل ضرور حاضر ہوں گا۔ کھانا بھی کھاؤں گا اور باتیں بھی کروں گا۔"

چلتے وقت میں نے پوچھا "آپ کا قیام کہاں ہے؟ آپ کو رات کے وقت یہاں پہنچنے میں دشواری تو نہیں ہوگی۔"

کہنے لگے "میں نئی دہلی میں ایک ہندوستانی دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوں۔ آپ کا کالج تو ایسی جگہ ہے کہ یہاں پہنچنے میں مجھے کوئی دِقّت نہیں ہوگی۔ میں مغرب کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔"

دوسرے دن شام کو رالف رسل وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئے۔

کہنے لگے "میں ذرا وقت سے کچھ پہلے آ گیا ہوں۔ اس خیال سے کہ آپ کے ساتھ کچھ زیادہ وقت گذار سکوں گا۔ آپ سے استفادہ کرنے کا جذب و شوق مجھے یہاں ذرا جلدی کھینچ لایا ہے۔ معذرت خواہ ہوں۔"

میں نے کہا "آپ نے بہت اچھا کیا کہ وقت سے کچھ پہلے آ گئے۔ ذرا اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔ آپ تو بہت اچھی اُردو میں باتیں کرتے ہیں۔ آپ کا لہجہ بھی اُردو والوں کا سا ہے۔ آپ انگریزی لہجے میں اُردو نہیں بولتے، اور یہ میرے خیال میں بڑی بات ہے۔"

رالف بولے "یہ آپ کی محبت ہے۔ ابھی تو میری اُردو میں بہت سی خامیاں ہیں۔ بولنے کی مشق زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے ذرا رُک رُک کر بولتا ہوں۔ بعض اوقات تو الفاظ کو تلاش کرنا پڑتا ہے، اور وہ ہاتھ نہیں آتے"۔

میں نے کہا "آپ تو خاصی بامحاورہ اور رواں اُردو بولتے ہیں۔ آپ نے یہ زبان سیکھی کیسے اور آپ کو اس کو بولنے اور اس میں کام کرنے کا شوق کس طرح پیدا ہوا؟"

رالف نے کہا "میں دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں برطانوی فوج میں ملازم ہو گیا۔ دورانِ ملازمت کچھ ہندوستانیوں کے ساتھ میرا وقت گذرا لیکن یہ لوگ مدراسی تھے اور تامل بولتے تھے۔ لیکن ان میں سے بعض اُردو بھی بول لیتے تھے۔ مجھے یہ زبان اچھی لگی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ یہ زبان سیکھنی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا، اور چند مہینے میں مجھے اس زبان میں کچھ شُدبُد ہو گئی۔ اب لکھ پڑھ لیتا ہوں۔ لیکن صحیح طور پر مجھے بولنا نہیں آتا۔ مشق کی کمی ہے۔ اگر کچھ عرصے آپ حضرات کے ساتھ رہوں گا تو مجھے اس زبان میں باتیں کرنے کی مشق ہو جائے گی۔ اور میں صحیح اُردو بولنے لگوں گا"۔

میں نے کہا کہ "چند مہینے میں آپ کی ترقی حیرت انگیز ہے۔ انشاء اللہ جلد آپ اس زبان پر عبور حاصل کر لیں گے"۔

غرض کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک ہم لوگ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔

پھر کھانا لگا دیا گیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ آج میں نے کھانے میں بریانی، قورمہ، کباب اور شیرمال وغیرہ کا خاص اہتمام کیا تھا تاکہ رالف کو ہمارے کھانے کا صحیح طور پر علم ہو سکے۔ اُنہوں نے مزے لے لے کر دیر تک یہ سب چیزیں کھائیں اور اُن کی نفاست اور لطافت کی دل کھول کر داد دی۔

کہنے لگے "انگریزوں کے کھانے سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں۔ اُن میں مزہ نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف پیٹ بھرنے کے لئے صرف غذا کے خیال سے کھائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے کھانوں کی کیا بات ہے! اِن کھانوں سے اُن کی تہذیبی برتری کا اندازہ ہوتا ہے"۔

میں نے کہا "یہ بات صحیح ہے۔ صدیوں میں اِن کھانوں نے یہ صورت اختیار کی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جو لذت اِن کھانوں میں ہے وہ کسی دوسرے ملک کے کھانوں میں نہیں"۔
رسل کوئی دس بجے تک ہمارے ساتھ رہے، اور اُنہوں نے مختلف موضوعات پر اپنے شگفتہ انداز میں بے شمار باتیں کیں۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا کہ "اب آپ ایک پان بھی کھا لیجئے۔ اس لئے کہ اس قسم کے کھانے کے بعد پان ضرور کھایا جاتا ہے"۔
میرے کہنے پر کھانے کو تو پان رالف نے کھا لیا، لیکن چونکہ اس سے قبل انہیں پان کھانے کا تجربہ نہیں ہوا تھا اس لئے پان کھا کر وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ اُن کے انداز سے معلوم ہوا کہ کچھ بے چین سے ہیں۔ لیکن خود اُنہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔
میں نے اُن کی اس بے چینی کو دیکھ کر کہا کہ "پان ہمارے کلچر کی چیز ہے۔ اس کو کھائے بغیر اُردو زبان نہیں آ سکتی"۔
کہنے لگے "اسی لئے تو میں نے پان کھا لیا۔ اب مجھے اُردو زبان میں ضرور مہارت حاصل ہو جائے گی"۔ اور یہ کہہ کر اُنہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
جب پان کھا کر وہ اپنی جائے قیام پر واپس جانے لگے تو میں نے کہا "پرسوں ہم نے کالج ہال میں ایک مشاعرہ کیا ہے۔ اس میں ہندوستان کے بعض بڑے شاعر شریک ہوں گے اور اپنا کلام سنائیں گے۔ جوش صاحب، جگر صاحب، مولانا حسرت موہانی، اثر صاحب، مجاز اور جذبی وغیرہ نے اس مشاعرے میں آنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ کے لئے مشاعرے میں شریک ہونے کا اچھا موقع ہے۔ اس میں ضرور شرکت کیجئے تاکہ مشاعرے اور اس کے آداب سے آپ کو آشنا ہونے کا موقع ملے۔ یہ بھی ہمارے کلچر کی چیز ہے"۔
رالف نے مشاعرے میں آنے کا وعدہ کیا، اور رات گئے تک ہمارے ساتھ رہ کر رخصت ہوئے۔
تین دن کے بعد مشاعرہ ہوا تو اُس میں بھی شریک ہونے کے لئے وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئے۔ میں انتظامات میں مصروف تھا۔ اس لئے میں نے انہیں ساتھ لیا، اور کالج ہال میں مشاعرے کی فرشی نشست کا جو انتظام تھا، وہ انہیں دکھایا۔ چاندنی کے فرش، گاؤ تکیوں، خاص دان، اگال دان اور شمع دان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور فرشی مشاعرے

کی تہذیبی اہمیت پر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

کہنے لگے "میرا تو اس قسم کے مشاعرے میں شریک ہونے کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ یہ ماحول مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ نے اس مشاعرے میں مدعو کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔ آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں؟"

میں نے مشاعرے اور فرشی نشست کے آداب پر کچھ روشنی ڈالی، اور چاندنی کے فرش، گاؤ تکیے، خاصدان، اگال دان اور شمع دان وغیرہ کی تہذیبی اہمیت کو واضح کیا، اور کہا کہ "چاندنی کا فرش آنکھوں کو بھلا لگتا ہے، شاعر، گاؤ تکیے پر ٹیک لگا کر اطمینان سے فرش پر بیٹھتے ہیں۔ خاص دان میں پان کی گلوریاں رکھی جاتی ہیں۔ بیشتر شاعر پان کھاتے ہیں۔ اُگالدان پیک تھوکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ شمع دان میں شمع روشن کی جاتی ہے۔ جب شاعر اپنا کلام سُناتا ہے تو اُس کے سامنے شمع رکھی جاتی ہے۔ وہ کلام سُناتا ہے تو حاضرین مصرعہ اُٹھاتے ہیں، اور 'واہ واہ' اور 'سُبحان اللہ' کہہ کر داد دیتے ہیں۔"

یہ باتیں میں نے رسل کے سامنے اس لیے کیں کہ انہیں مشاعرے کی فضا سے کچھ واقفیت ہو جائے، اور وہ اپنے آپ کو اس محفل میں اجنبی محسوس نہ کریں۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کچھ شعراء آ گئے۔ میں نے اُن سے رسل کا تعارف کروایا، اور وہ چند لمحوں میں اُن کے ساتھ گھُل مِل گئے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل وہ اُن سے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔

مشاعرہ شروع ہوا تو میں نے رالف کو شعراء کے ساتھ ڈائس پر بٹھایا۔ اور وہ جوش صاحب، جگر صاحب، اثر صاحب، مولانا حسرت موہانی، مجاز اور جذبی وغیرہ کے ساتھ تین گھنٹے تک فرش پر بیٹھے رہے۔ تمام شاعروں کا کلام اُنھوں نے اس طرح سُنا جیسے ان کے ہر شعر کو سمجھ رہے ہیں، اور اُن کے کلام سے محظوظ ہو رہے ہیں لیکن اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی رہیں۔

جب مشاعرہ اختتام کو پہنچا تو میں نے اُن سے پوچھا "کہیے، مشاعرہ آپ کو کیسا لگا؟" کہنے لگے "ایک لفظ میرے پلے نہیں پڑا۔ لیکن میں شعراء اور حاضرین کو اپنے انداز سے

یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ مصرعہ اٹھانا تو میرے لئے مشکل تھا۔ البتہ میں داد دینے کی کوشش ضرور کرتا رہا۔"

میں نے کہا "آپ نے ایک اہم مرحلہ طے کرلیا ہے۔ اب آپ کی اُردو روز بہ روز بہتر ہوتی جائے گی۔"

رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ شعراء کے ساتھ کھانا کھاکر رُخصت ہوئے، اور چند روز بعد اپنے پروگرام کے مطابق علی گڑھ اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ وقت ان شہروں میں گذارا۔ اہل علم سے ملے۔ وہاں کے ماحول سے اپنے آپ کو آشنا کیا، اور پھر واپس لندن چلے گئے۔

لندن میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی، اور اُردو میں بی۔ اے آنرز کر کے وہیں ڈاکٹر گراہم بیلی کے انتقال کے بعد اُن کی جگہ پر اُردو کے لیکچرار ہوگئے۔ اُن سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا، اور وہ مجھے اپنی علمی مصروفیات سے مطلع کرتے رہے۔

قیام پاکستان کے بعد میں لاہور آگیا، اور میں نے اورینٹل کالج میں تدریس وتحقیق کا کام شروع کر دیا۔ اس زمانے میں رالف کے ساتھ باقاعدگی سے خط وکتابت ہوتی رہی۔ اس طرح ہم لوگ ایک دوسرے کے قریب رہے اور ہمیں ایک دوسرے کی مصروفیات کا علم ہوتا رہا۔ اس زمانے میں رالف نے میر تقی میر، سودا، میر حسن اور غالب وغیرہ پر کام کیا، اور غزل کی صنف پر بھی کچھ مضامین لکھے۔ ان مضامین کی ٹائپ شُدہ کاپیاں اُنہوں نے مجھے بھیجیں۔ میں نے اُن کے یہ مضامین شوق اور دلچسپی سے پڑھے۔ ان سے مجھے اُن کے تجزیاتی مزاج کا اندازہ ہوا اور یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ وہ اُردو کے کلاسیکی شعراء سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر خورشیدالاسلام اس زمانے میں اُن کے رفیق کار رہے، اور اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے کی وجہ سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ اُردو زبان بولنے کی مشق بھی خاصی ہوگئی اور قدیم اُردو شاعری کے اسرار رموز بھی اُن کے سامنے بے نقاب ہوگئے۔ خورشیدالاسلام صاحب جب لندن سے واپس علی گڑھ چلے گئے تو اُن کی جگہ پر عزیز احمد صاحب مرحوم کا

تقرر ہوا۔ ان کے ساتھ بھی رالف کو کئی سال تک کام کرنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں انھوں نے عزیز احمد صاحب مرحوم کے ناول ایسی بلندی ایسی پستی کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا جو بہت مقبول ہوا۔

عزیز احمد صاحب جب لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اپنا ٹرم پورا کرکے ٹورنٹو یونیورسٹی میں اسلامی علوم کے پروفیسر ہوگئے تو لندن یونیورسٹی کے شعبۂ پاکستان و ہند میں اُستاد کی ایک جگہ خالی ہوئی۔ رسل نے اس جگہ کے لئے ارباب اختیار کے سامنے میرا نام پیش کیا جو منظور کرلیا گیا۔

یہ کاروائی کرنے کے بعد رالف نے مجھے لکھا کہ یہاں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اُردو کے لیکچرار کی ایک جگہ ہے۔ اس سے قبل اس جگہ پر ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور مشہور ناول نگار اور نقاد عزیز احمد صاحب کام کرچکے ہیں۔ اس جگہ پر تقرر تین سال کے لئے ہوتا ہے۔ اگر آپ اس جگہ کو قبول کرلیں اور یہاں آجائیں تو اسکول کے لئے، یہاں کے طالب علموں کے لئے اور خود میرے لئے (یعنی رسل کے لئے) بہت مفید ہوگا۔

میں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ اگر میری یونیورسٹی نے مجھے تین سال کی چُھٹی دے دی، اور حکومت پاکستان کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو میں اس آفر کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

چنانچہ اس سلسلے میں مناسب کاروائی کی گئی۔ پنجاب یونیورسٹی نے مجھے تین سال کی چُھٹی دے دی۔ وزارت تعلیمات حکومت پاکستان سے اجازت نامہ بھی مل گیا، اور اکتوبر ۱۹۶۲ء میں تین سال کے لئے میں لندن چلا گیا۔

لندن ایئرپورٹ پر پہنچا تو رالف رسل وہاں موجود تھے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایئرپورٹ پر پہنچیں گے کیونکہ وہ اُن دنوں لندن سے کوئی تیس میل دور ہارلو کی نئی آبادی میں رہتے تھے۔

میں ایئرپورٹ سے باہر نکلا تو رسل نے آگے بڑھ کر کہا آداب عرض کرتا ہوں۔ دیکھئے

میں ایئر پورٹ پر پہنچ گیا۔ سوچا آپ کا استقبال کیا جائے۔ آپ کا سفر آرام سے تو گذرا؟"۔
میں نے کہا "بڑے آرام سے آیا ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی"۔
اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بولے "اب آپ لندن میں ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں۔ سفر میں تو تھوڑی بہت تکلیف ہوتی ہی ہے۔ لیکن اب یہاں لندن میں انشاءاللہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں ہر خدمت کے لئے ہمیشہ حاضر رہوں گا"۔
میں نے کہا "بھئی! آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ اتنی دور سے آپ ایئر پورٹ آئے، اور پھر رات کے وقت"۔ یقیناً آپ کو بہت زحمت ہوئی ہوگی"۔
رسل کہنے لگے "آپ پہلی دفعہ لندن آرہے تھے۔ اس لئے میں نے سوچا، ہوائی اڈے پر آپ کا استقبال کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں آگیا"۔
یہ کہہ کر انہوں نے میرا سوٹ کیس اٹھایا، اور کہا "چلئے، باہر چلتے ہیں۔ ٹیکسی کرتے ہیں جو ہمیں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور رسل اسکوائر کے قریب ویورلی ہوٹل پہنچا دے گی۔ آپ کے قیام کا انتظام یونیورسٹی کی طرف سے ویورلی ہوٹل میں ہے"۔
ہم لوگ باہر نکلے تو ایک ٹیکسی سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ رالف نے اس کو اشارے سے بلایا۔ وہ ٹیکسی قریب آگئی۔ ہم نے اس میں سامان رکھا اور ویورلی ہوٹل روانہ ہوگئے۔
ویورلی ہوٹل پہنچ کر ہم نے کاؤنٹر پر نام وغیرہ لکھوایا۔ اس کے بعد رسل نے سوٹ کیس اٹھا کر لفٹ میں رکھا، اور ہم تیسری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچے۔
رسل میرے پاس کوئی ایک گھنٹہ بیٹھے اور دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب وہ یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ "میں اب اجازت لوں گا۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔ مجھے ہارلو جانا ہے جو یہاں سے کوئی پچیس تیس میل ہے۔ اب بارہ بجے کے بعد گھر واپس پہنچوں گا۔ صبح اسکول میں ملاقات ہوگی۔ آپ دس بجے اطمینان سے آیئے۔ رسل اسکوائر کے پارک میں سے ہو کر جب آپ باہر آئیں گے تو سامنے آپ کو اسکول کی عمارت نظر آئے گی۔ میں آپ کو ووبرن اسکوائر میں اپنے کمرے میں ملوں گا۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر اسکول کی نئی عمارت میں جائیں گے اور آپ کے تقرر کے سلسلے میں دفتری کاروائی کریں گے۔

رسل کے جانے کے بعد میں یہ سوچتا رہا کہ یہ شخص انگریز ہونے کے باوجود مشرقی آداب کا کتنا پابند ہے، اور اس کے مزاج میں اخلاص کی وہ خوشبو کس درجہ بسی ہوئی ہے جس سے مشرق اور خصوصاً ہندوستان پاکستان کے لوگ پہچانے جاتے ہیں۔ شاید یہ اُردو زبان، اُردو ادب اور اُردو تہذیب کا اثر ہے جو اس کی شخصیت کا جُز بن گیا ہے۔

لندن کے دوران قیام میں مجھے رالف کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم لوگ چھ سال تک ایک ساتھ رہے۔ ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر ہم نے کام کیا۔ ایک ساتھ دن کا کھانا کھایا۔ ایک ساتھ کافی پی۔ ایک ساتھ شام کی چائے پی۔ ایک ساتھ علمی ادبی کام کے منصوبے بنائے۔ ایک ساتھ اُردو کی تعلیم کے لئے نصاب بنایا۔ ایک ساتھ اسکول کے شعبۂ اُردو کے لئے اُردو کے اہم شاعروں اور ادیبوں کی ریکارڈنگ کی، اور ان کی آوازیں اپنے طالب علموں کو سنائیں۔ غرض چھ سال تک ہم لوگ اِن کاموں میں مصروف رہے۔

لندن میں میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ مکان کا حاصل کرنا تھا۔ رالف نے اس کام میں میری بڑی مدد کی۔ لندن یونیورسٹی کے لاجنگ بیوریو سے انھوں نے رابطہ قائم کیا، اور میرے ساتھ کئی مکان دیکھنے گئے۔ سب سے پہلے وہ مکان دیکھتے وقت باورچی خانے (کچن) میں جاتے تھے۔ اس کے بعد دوسرے کمروں کا جائزہ لیتے تھے۔

میں نے اُن سے پوچھا "آپ سب سے پہلے "کچن" کیوں دیکھتے ہیں؟"

کہنے لگے۔ "اچھے اور آرام دہ کچن کے بغیر مکان مجھے مکان نہیں معلوم ہوتا۔ کچن کشادہ اور صاف ستھرا ہو تو مکان میں جی لگتا ہے۔ دوسرے کمروں کو میں ثانوی اہمیت دیتا ہوں۔"

بہر حال کئی مکان دیکھنے کے بعد رسل کو ایک مکان پسند آیا، اور میں ویورے ہوٹل کو خیر باد کہہ کر اُس مکان میں منتقل ہو گیا۔ میں اُس وقت لندن میں تنہا تھا۔ اس لئے شام کا کھانا بھی خود ہی پکانا پڑتا تھا۔ شام کا خاصا وقت جب کچن میں گذارنا پڑا تو رسل کے اس خیال کی حقیقت واضح ہوئی کہ کچن اچھا آرام دہ اور صاف ستھرا ہونا چاہیئے۔ چند روز بعد جب میرے گھر والے لندن آ گئے تو اُنھوں نے بھی رسل کے اس خیال سے اتفاق کیا۔

رالف اس زمانے میں لکچرار تھے۔ تقریباً آٹھ دس سال اُنھوں نے اسکول میں لکچرار کی

حیثیت سے گذارے۔ ابھی تک اُن کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے انہیں ریڈر نہیں بنایا گیا تھا۔ انہوں نے اس زمانے میں سوداؔ، میرؔ، میر دردؔ اور میر حسنؔ پر اچھا خاصا کام کر لیا تھا۔ اس کی ٹائپ شدہ کاپی مجھے پڑھنے کے لئے دی۔ مجھے اُن کا یہ کام پسند آیا۔ میں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ اس کام کو اُن کی ریڈرشپ کے لئے بُنیاد بنائی جائے۔ اس خیال سے کہ اُن کے ریڈر ہونے کے بعد شعبے میں اُردو کی ترقی کا سامان پیدا ہوگا۔

چنانچہ میں نے ایک دن شعبۂ ہندوستان و پاکستان کے صدر اور سنسکرت کے عالم پروفیسر براف Professor Brough سے اس سلسلے میں بات کی، اور اُن سے کہا کہ "رالف رسل آٹھ دس سال سے لیکچرار ہیں۔ انہیں کم از کم اُردو میں ریڈر ضرور ہونا چاہیئے"۔

پروفیسر براف نے کہا "لیکن ابھی تک اُن کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے ابھی تک اُن کے ریڈر ہونے کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کے لئے کچھ شائع کرنا ضروری ہے"۔

میں نے کہا "رالف نے اُردو کے کلاسیکی شاعروں پر اعلےٰ درجے کا کام کیا ہے۔ میر، سودا، دردؔ اور میر حسن پر انہوں نے خیال انگیز مقالے لکھے ہیں۔ ان کی یہ کتاب جلد چھپ جائے گی۔ اس کا ٹائپ شدہ نسخہ میرے پاس ہے"۔

پروفیسر براف نے کہا "یہ نسخہ آپ مجھے دے دیجئے۔ میں رالف کی ریڈرشپ کے معاملے میں مناسب کاروائی کروں گا"۔

میں نے وہ نسخہ پروفیسر براف کو دے دیا۔ اُنہوں نے اس کا مطالعہ کیا۔ کچھ عرصے بعد ایک دن وہ سینئر کامن روم ملے۔ ہم نے کافی پی، اور باتیں کیں۔

پروفیسر براف نے کہا "میں نے رالف رسل کی کتاب کے ٹائپ شدہ نسخے کا مطالعہ شوق اور دلچسپی کیا۔ اُن کا کام بہت اچھا ہے۔ اس لئے میں نے اُردو کی ریڈرشپ کے لئے اُن کی سفارش کر دی ہے۔ اور اسکول کے ڈائرکٹر اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار کو لکھ کر بھیج دیا ہے کہ انہیں ریڈر ہونا چاہیئے۔

چند ہفتے میں اس کا فیصلہ ہو جائے گا اور اُنہیں اُردو کی ریڈرشپ مل جائے گی۔

اور چند ہفتے بعد وہ واقعی پروفیسر براف کی سفارش پر اُردو کے ریڈر بنا دیئے گئے۔ اور اس سے شعبۂ اُردو کو بہت فائدہ پہنچا۔

رسل کے مزاج میں قلندری تھی۔ وہ نظریاتی اعتبار سے مادہ پرست اور اشتراکی تھے لیکن مادیت سے اُنہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر صرف کام کرتے تھے۔ اپنے مضمون میں کام کرنا اُن کے نزدیک عبادت سے کم نہ تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے وہ ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ طالب علموں کو اُردو زبان و ادب پڑھانے کا خاصا کام انہوں نے اپنے ذمّے لے رکھا تھا، اور لوگوں کا خیال یہ تھا کہ پڑھانے کے کام کے لئے وہ زیادہ وقت دیتے ہیں۔ ابتدائی جماعتوں کو وہ ہفتے میں آٹھ دس لیکچر ضرور دیتے تھے۔ اس کے علاوہ نصاب کی ترتیب کا کام بھی کرتے تھے۔ ٹیوٹوریل بھی لیتے تھے، سیمینار بھی ترتیب دیتے تھے۔ اور پھر اُردو ادب کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ اُردو کی کچھ اہم کتابیں انہوں نے میرے ساتھ بھی مل کر پڑھیں، اور اُن کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کے علاوہ اُن کا خاصا وقت ادبی موضوعات پر لکھنے میں بھی صرف ہوتا تھا۔ صنف غزل کے اصول، اہم غزل گو شعراء کے کلام کا مطالعہ، میر اور غالب کی شخصیت اور شاعری ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات تھے۔ میر، سودا، دردؔ اور میر حسن اور غالب کی سوانح پر انگریزی میں اُن کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو سے اُن کو کتنی دلچسپی ہے اور وہ اس زبان و ادب پر کام کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اُردو میں لکھنے کی تو انہیں ایسی کچھ زیادہ مشق نہیں ہے۔ البتہ اُن کا خط بہت اچھا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے تختی لکھی ہے اور اس صورت حال نے اُن کی تحریر میں پختگی پیدا کر دی ہے۔ اُردو لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موتی پرو رہے ہیں۔ لیکن اُردو میں خط یا مضمون لکھتے ہوئے وہ گھبراتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے۔ چنانچہ وہ خط عام طور پر انگریزی میں لکھتے ہیں، اور علمی ادبی کام بھی انگریزی زبان میں کرتے ہیں۔ اُردو تیزی سے نہیں لکھتے لیکن

جو کچھ لکھتے ہیں وہ صحیح لکھتے ہیں۔

البتہ اُردو بولنے میں انہوں نے کمال حاصل کیا ہے۔ بالکل کسی اہل زبان کی طرح روزمرہ اور محاورے کے ساتھ صحیح لہجے میں اُردو بولتے ہیں۔ اُردو بولتے ہوئے کبھی غلطی نہیں کرتے اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں لطیفے بھی سُناتے ہیں۔ گالیاں بھی بک سکتے ہیں۔ ہنسی مذاق بھی کر سکتے ہیں۔ اُن کا تلفظ بھی ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔ آداب کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ گفتگو میں کبھی کوئی انگریزی لفظ استعمال نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں تو حال یہ ہے کہ اُردو بولتے ہوئے لوگ انگریزی کے بے شمار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ رالف کو اس سے سخت اُلجھن ہوتی ہے۔ اُردو بولتے ہوئے اگر کوئی انگریزی کا لفظ استعمال کرے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اُردو کا کوئی نیا لفظ استعمال کر رہا ہے جو اُن کے لئے اجنبی ہے۔

ایک دن اُن سے باتیں کرتے ہوئے میں نے انگریزی کا کوئی لفظ استعمال کیا تو فوراً سنجیدگی سے بولے "اس لفظ کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ اُردو کا لفظ ہے"؟

میں نے کہا "نہیں، یہ اُردو کا لفظ نہیں ہے۔ یوں ہی انگریزی کا لفظ بے خیالی میں میری زبان پر آ گیا"۔

کہنے لگے "مجھے یہ شبہ ہوا کہ آپ نے اُردو کا کوئی ایسا لفظ بولا ہے جس کو میں نہیں سمجھتا"۔

میں نے کہا "میں نے انگریزی کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اُردو کا کوئی مترادف لفظ میرے ذہن میں نہیں آیا۔ اس لئے میں نے اس کی جگہ انگریزی کا لفظ استعمال کیا۔ اُردو میں یہ عام بات ہے۔ لوگ بے تکلفی سے انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں"۔

کہنے لگے "ایسا کرنا نہیں چاہیئے۔ انگریزی اور اُردو الفاظ کی کھچڑی مجھے اچھی نہیں لگتی"۔

میں نے کہا "آپ کی بات صحیح ہے۔ ایسا ہونا نہیں چاہیئے۔ احتیاط ضروری ہے"۔

رالف رسل کے مزاج میں بذلہ سنجی بہت ہے۔ وہ کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے۔ کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور چُست کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو میں کسی نہ کسی پر کوئی پھبتی ضرور ہوتی ہے۔ وہ کسی نہ کسی پر چوٹ ضرور کرتے ہیں۔ جو اُردو نہیں جانتا اور نہیں سمجھتا اُس کو بناتے

ضرور ہیں۔

ایک دن ہم لوگ اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز کے کامن روم میں بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے۔ کافی پیتے ہوئے اُن کی طبیعت رواں ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے کئی پروفیسروں کے بارے میں انہوں نے فقرے کسے۔

ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ تو بالکل بندر معلوم ہوتا ہے۔ یار! اس کی شکل تو دیکھئے"۔

دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا "یہ بڑا ہی بدمعاش آدمی ہے۔ اس کو حرام زادہ کہنا چاہیئے"۔

تیسرے کی طرف دیکھ کر یوں گویا ہوئے "واہ بیٹا! واہ، تمہاری کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ ایسا اول جلول آدمی کبھی آپ نے دیکھا ہے"؟

پھر چوتھے کی طرف توجہ فرمائی اور بولے "یہ الّو ہے، بلکہ اُلّو کا پٹھا ہے"۔

میں اُن کی گُل افشانیٔ گفتار کا یہ عالم دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا لیکن چُپ رہا۔ جن بے چاروں کے بارے میں وہ اس قسم کے فقرے اُچھال رہے تھے، انہیں کیا خبر کہ رسل صاحب کیا فرما رہے ہیں۔

غرض رالف اس طرح اکثر یہ سب کچھ کہہ کر اپنی اردو دانی سے فائدہ اٹھا کر چائے اور کافی کی محفلوں کو اپنی بذلہ سنجی سے زعفران زار بناتے تھے۔

لڑکیوں کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ کبھی کوئی حسین لڑکی نظر آتی تو کہتے "یہ تو میری جان ہے۔ واہ میری جان! واہ میری جان! ہم اس پر مر سکتے ہیں"۔

کسی قبول صورت لڑکی کو دیکھتے تو کہتے "یہ نیم جان ہے۔ میری جان نہیں ہو سکتی"۔

کسی بدصورت لڑکی کو دیکھتے تو فرماتے "یہ بے جان ہے۔ کسی کام کی نہیں۔ مجھے اس کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اس پر ترس آتا ہے۔ کسی کا دل نہیں لبھا سکتی۔ کسی پر تیر نہیں چلا سکتی۔ کسی کو گھائل نہیں کر سکتی"۔

لندن کی سڑکوں پر چلتے ہوئے، یونیورسٹی میں گھومتے ہوئے، اُن کے اس قسم کے

فقرے سن کر میں ہمیشہ یہ کہتا کہ "اگر ان میں سے کوئی اُردو سمجھنے والا ہوا تو تمہیں جان ہی سے مار دے گا۔ آپ کی یہ ساری بذلہ سنجی دھری رہ جائے گی"۔

رسل یہ سُن کر کہتے "کچھ نہیں ہو گا۔ ہم تو سچے آدمی ہیں۔ صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ ہم تو اپنی اُردو ٹھیک کر رہے ہیں۔ عشق کیا تو ڈرنا کیا"۔

ایک دن واقعی اُن کی یہ بذلہ سنجی رنگ لائی۔

ہوا یوں کہ ہم لوگ پکاڈلی سے شیفٹس بری ایونیو ہوتے ہوئے کسی کام سے آکسفورڈ اسٹریٹ کی طرف جا رہے تھے، آکسفورڈ اسٹریٹ پر پہنچے تو ایک ایسے صاحب نظر آئے جو پرانے انداز کے سوٹ میں ملبوس، سر پر کنسونیشنل قسم کا فیلٹ ہیٹ، ہاتھ میں چھتری۔ یہ صاحب بڑی تیزی سے جا رہے تھے۔ اُن کو دیکھا تو رسل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اور کہا "نو نو ہے نو نو۔ وکٹورین عہد کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ایسی کی تیسی یہ تو مجھے ہو بہو نذیر احمدؒ کا ظاہر دار بیگ معلوم ہوتا ہے"۔

اس نے یہ فقرے سُن لئے اور فصیح اُردو میں کہا "جناب کی زبان کو لگام نہیں۔ تمیز سے بات کیا کیجئے۔ میں پُرانا آئی۔ سی۔ ایس ہوں۔ ہندوستان میں کئی سال رہ چکا ہوں۔ اُردو جانتا ہوں۔ آپ کی باتیں سُنیں۔ یہاں اس ملک میں تو ہر طرح کی آزادی ہے۔ آپ ہندوستان میں ہوتے اور اس طرح کی لغو اور بے ہودہ باتیں کرتے تو آپ کو مزہ چکھا دیتا"۔

یہ کہہ کر وہ صاحب تو آگے بڑھ گئے اور کسی اسٹور میں چلے گئے۔ لیکن ہم لوگوں کا بُرا حال ہوا۔ کاٹو تو لہو نہیں۔

میں نے رالف سے کہا "دیکھا آپ نے! آج ایک ایسے شخص سے مڈبھیڑ ہو ہی گئی جو اُردو جانتا ہے۔ پٹنے میں کیا کسر رہ گئی تھی؟"۔

رسل کہنے لگے "کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہونا چاہیئے۔ ایں ہم اندر عاشقی"۔

لندن کے دوران قیام میں ہم لوگ دن کا کھانا، کبھی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، کبھی برک بک کالج، کبھی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اور کبھی یونیورسٹی کالج لندن کی رفیکٹری میں کھاتے تھے۔ اُستاد کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی کے کسی کالج یا انسٹی ٹیوٹ کی رفیکٹری میں میں

کھانا کھانے کی اجازت تھی۔ اپنے اسکول کی ریفیکٹری میں رسل کم جاتے تھے کیونکہ وہاں پروفیسروں کے ساتھ ایک خاص کمرے میں پورے آداب کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا تھا۔ عورتیں یہاں کھانا لاکر فرداً فرداً ہر ایک اُستاد کے سامنے رکھتی تھیں۔ رسل کو یہ رسمی سا ماحول پسند نہیں تھا۔ وہ تو (SELF SERVICE) یعنی لائن میں کھڑے ہو کر کھانا لینے اور بے تکلفی سے بیٹھ کر کھانے کے عادی تھے۔ چھُری کانٹے تک کا استعمال انہیں ناگوار گذرتا تھا۔ وہ تو ہاتھ سے کھانا پسند کرتے تھے۔

ایک دن ہم لوگ برک بیک کالج میں کھانا کھانے گئے تو کھانے میں مرغ تھا۔ میں نے چھُری کانٹے سے مُرغ کھانا شروع کیا۔

رسل نے یہ دیکھ کر کہا "چھری کانٹے سے مُرغ کھانا اس کھانے کی توہین ہے۔ آپ اس کو ہاتھ سے کھایئے ورنہ آپ بہت جلد تھک جائیں گے۔ بلکہ بیزار ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "آپ نے میرے دل کی بات کہی۔ واقعی مجھے چھُری کانٹے سے کھانے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔"

رالف بولے "مُرغ کو چھری کانٹے سے کھانا محض تکلّف ہے۔ انگریز خواہ مخواہ یہ تکلّف کرتے ہیں۔ اس کو تو صرف ہاتھ سے کھانا چاہیئے۔"

غرض رالف رسل کھانا کھاتے ہوئے کبھی مغربی آداب کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ خالص مشرقی انداز میں ہندوستانیوں کی طرح کھانا انہیں پسند تھا۔

رالف رسل کو سرگشتۂ خمار رسوم و قیود ہونا مہمل بات معلوم ہوتی تھی۔ مزاج کے اعتبار سے وہ انقلابی تھے۔ اور رسمی ماحول کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں کی پابندیٔ رسم و رواج کو اُن کی سامراجیت پر محمول کرتے تھے۔ اور وہ سامراجیت کے دُشمن تھے۔ اُن کا مزاج عوامی تھا اور وہ اشتراکیت کے راستے پر گامزن تھے۔ ان کے خیال میں سامراجیت اور سرمایہ پرستی انسانی زندگی کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتی تھی۔ انسانیت اور انسان دوستی اُن کا نصب العین تھا۔ وہ تمام انسانوں کو برابر دیکھنے کے خواہش مند تھے، اور مشرق و مغرب میں ایک ایسے نظام کی ترویج کے قائل تھے جو طبقاتی تفریق کو

مٹا دے، اور تمام انسانوں کو ایک سطح پر لاکر کھڑا کر دے۔ آج بھی وہ اس کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔

لندن یونیورسٹی میں ایسے اساتذہ کا ایک حلقہ تھا جو اشتراکیت پسند اور انقلابی تھے۔ رالف رسل اس کے خاصے فعال کارکن تھے۔ یہ لوگ ہفتے میں ایک دن، غالباً جمعہ کو مل بیٹھتے تھے، اور آپس میں تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

ایک دن میں جمعہ کو اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا خاصی تعداد میں لوگ جمع ہیں۔ رسل بھی اُن میں موجود ہیں۔ میں پہنچا تو جلسہ برخاست ہو چکا تھا، اور لوگ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

جب یہ لوگ چلے گئے تو میں نے رسل سے پوچھا "یہ کون لوگ تھے؟ اور یہ جلسہ کس سلسلے میں تھا؟"

اپنے مخصوص انداز میں بولے "یہ سب یونیورسٹی کے اساتذہ ہیں۔ ترقی پسند اور انقلابی ہیں۔ ہفتے میں ایک دن ہم لوگ مل بیٹھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے معاملات، اساتذہ کے مسائل اور عام سیاسی حالات پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ اور عوام کے لئے کام کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ اس ملک میں فکر و عمل کی آزادی ہے۔ اساتذہ پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ وہ سیاست میں بھی حصّہ لے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ بات تو اچھی ہے لیکن اس کمرے میں اگر یہ جلسہ نہ ہو تو اچھا ہے کیونکہ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے تو کچھ عرصے کے بعد پاکستان واپس جانا ہے۔ وہاں اس قسم کی آزادی کا کوئی تصور نہیں۔"

کہنے لگے "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ ایک آزاد ملک میں ہیں جہاں یونیورسٹیوں میں فکر و خیال کی مکمل آزادی ہے۔ اور پھر آپ کا تو اس تنظیم سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ یہ تو سب انگریز ہیں۔"

میں نے کہا "لیکن آپ لوگ برطانیہ کے ایسے مُلک میں کس قسم کا انقلاب چاہتے ہیں؟ یہ تو فلاحی مملکت ہے یہاں تو وہ سب کچھ موجود ہے جس کی کسی شہری کو ضرورت

ہوتی ہے"۔

رسل نے قہقہہ لگا کر کہا آپ کی بات صحیح ہے۔ یہاں ہر شخص کو آزادی ہے۔ ہر شخص کو روٹی بھی مل جاتی ہے۔ کام بھی مل جاتا ہے۔ بیکار ہو جائے تو پنشن بھی ملتی ہے لیکن طبقاتی تفریق تو بہر حال یہاں ہے۔ ہم اس کو مٹانا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ یہاں بہت امیر ہیں، کچھ بہت غریب ہیں۔ اس تفریق کو ختم ہونا چاہیئے۔ ہم اسی کے لئے منصوبے بناتے اور کام کرتے ہیں"۔

میں اُن کی اِن باتوں سے سب کچھ سمجھ گیا اور دیر تک اُن کی گل افشانیٔ گفتار سے محظوظ ہوتا رہا۔

رالف دُھن کے پورے اور کام کے پکّے ہیں۔ ہر وقت اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھتے ہیں۔ وقت ضائع کرنے یا بیکار بیٹھنے کا کوئی تصور اُن کی شخصیت میں نہیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر حالت میں کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گذشتہ بیس پچیس سال میں اُردو زبان و ادب پر اچھا خاصا کام کیا ہے۔ اُردو زبان پر اُنہوں نے خاصی تعداد میں اعلےٰ پائے کے مقالے لکھے ہیں۔ اُردو کی اصناف شعر پر بھی خاصا کام کیا ہے۔ غزل پر بھی کئی فکر انگیز مقالے لکھے ہیں۔ اُردو کے کلاسیکی شعراء پر بھی انہوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔ میر تقی میر، مرزا سودا میر حسن وغیرہ پر اُن کی کتاب Three Mughal Poets کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ غالب کی زندگی اور شخصیت پر بھی ایک مبسوط کتاب انہوں نے بڑی محنت سے لکھی ہے جس کو لندن کے ایک پبلشر نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ غالب کی دوسری جلد جس میں اُن کے کلام کا انگریزی ترجمہ ہے۔ آج کل طباعت کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اُنہوں نے اُردو کا ایک نصاب بھی مُرتب کیا ہے جو اُردو پڑھنے والے انگریز طالب علموں کے لئے بہت مفید ہے۔ اس کی مدد سے اُردو پڑھنے والوں کو صرف چند مہینے میں اُردو زبان آجاتی ہے اور وہ اس زبان کو خود اعتمادی کے ساتھ لکھنے پڑھنے لگتے ہیں۔

اپنے ادبی کاموں کے سلسلے میں وہ اکثر ہندوستان اور پاکستان میں آکر کئی کئی مہینے

قیام کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اُن کا قیام علی گڑھ میں ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ہاں ہوتا ہے، اور پاکستان میں وہ لاہور میں میرے پاس ٹھہرتے ہیں۔ جتنے دن وہ میرے ہاں رہتے ہیں خوب رونق رہتی ہے۔ بے تکلف آدمی ہیں۔ بچوں کے ساتھ گھُل مل جاتے ہیں۔ دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ لطیفے سناتے ہیں۔ پھبتیاں کستے ہیں، اور اس طرح اُن کی وجہ سے گھر باغ و بہار بن جاتا ہے۔

ایک دن میں نے دیکھا میرے بیٹے فرحان سے کہہ رہے ہیں "یار جوجو! تمہارے گھر کے آس پاس کوئی بھینس دیکھنے کو مل سکتی ہے؟ مجھے بھینس بہت پسند ہے"۔

وہ کہہ رہا تھا "یہاں قریب تو کوئی بھینس نہیں ہے۔ البتہ آپ میرے ساتھ چلیں تو میں آپ کو بھینس کا دیدار کروا دوں گا۔ لیکن یہ بھینس دیکھنے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟ مجھے تو بھینس بالکل اچھی نہیں لگتی۔ عجب بے ہنگم قسم کا جانور ہے۔ کالا رنگ، بھاری بھرکم جسم، اُس سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔ اُس کی وجہ سے گندگی بھی بہت ہوتی ہے۔ ہر وقت جُگالی کرتی رہتی ہے۔ مجھے تو اُس سے گھِن آتی ہے"۔

رالف کہہ رہے تھے "میاں! اُس کی یہی ادا تو مجھے پسند ہے۔ کسی سے بولتی نہیں۔ کسی کو مارتی نہیں۔ کسی کو پریشان نہیں کرتی — اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سیروں دودھ دیتی ہے۔ اور دودھ مجھے بہت پسند ہے۔ خاص طور پر تازہ دودھ!"۔

اُس نے کہا "پھر ایک بھینس پال لیجیے، اور اُس کو لندن لے جائیے"۔

اور میں اِن دونوں کی یہ باتیں سُن کر محظوظ ہوتا رہا۔

رسل جب ہمارے ہاں پنجاب یونیورسٹی نیوکیمپس کے مکان میں ٹھہرتے تھے تو صبح کو ہم لوگ انہیں لے کر اس راستے سے اورینٹل کالج جاتے تھے جہاں اب علاّمہ اقبال ٹاؤن کی آبادی بن گئی ہے۔ راستے میں ایک چھوٹی سی مسجد آتی تھی۔ وہ کسی زمانے میں گاؤں کی ویران اور بوسیدہ سی مسجد تھی۔ رسل جب یہاں سے گذرتے تھے تو خود کلامی شروع کر دیتے تھے۔ کہتے تھے —

"یہ مسجد تو ہے لیکن بہت پُرانی ہے۔ اس کو ذرا غور سے دیکھنا چاہیئے۔ یہ صحیح معنوں

میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہے۔ میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا، جس کے پاس بھی جاؤں گا، اس سے کہوں گا کہ اگر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد دیکھنی ہو تو اس مسجد کو دیکھئے"۔

اور اُن کی اس خود کلامی کو سُن کر مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی تھی۔

غرض رالف رسل ہمیشہ اس طرح کی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ اِن باتوں میں مزاح کا پہلو ہوتا تھا لیکن ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اُردو زبان کے محاوروں اور کہاوتوں سے اُن کو کتنی دلچسپی ہے۔

صبح کو وہ ہمارے ہاں پوریوں کا ناشتہ کرتے ہیں۔ گرم گرم پھولی ہوئی پوریاں اُنہیں بہت پسند ہیں۔ مزے لے لے کر پوریاں کھاتے ہیں، اور بار بار یہ لطیفہ سُناتے ہیں کہ کسی انگریز کے سامنے جب پھولی ہوئی پوریاں پیش کی گئیں تو اُس نے کہا "یہ پھولتی کیسے ہے؛ اس میں ہوا کیسے بھری جاتی ہے"؟۔

اور گھر کے تمام لوگ اُن کی یہ باتیں سُن کر ہنسنے اور قہقہے لگاتے ہیں۔

غرض رسل کے آنے سے میرے گھر کے سب لوگ بہت خوش ہوتے ہیں، اور ان کے ساتھ ہم سب کا وقت بہت اچھا گذرتا ہے۔

پاکستان میں ہمارا گھر اُن کا ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے۔ یہاں سے وہ مختلف مقامات پر جاتے ہیں۔ اُن کی ایک محبوب جگہ گجرات کے ضلع میں ایک گاؤں کنیال ہے جہاں چودھری نذیر اُن کے ایک دوست ہیں جو کاشتکاری کرتے ہیں۔ وہ اُن سے ملنے ضرور جاتے ہیں، اور سرائے عالمگیر سے پندرہ بیس میل کا سفر دوسری سواریوں کے ساتھ تانگے میں کرتے ہیں۔ کنیال پہنچتے ہیں اور وہاں سے واپس آکر دلچسپ باتیں سناتے ہیں۔

ایک دفعہ کنیال سے واپس آئے تو میں نے پوچھا "کہیئے اب کے وقت کیسا گذرا"؟ کہنے لگے "بہت مزہ آیا۔ دو ہفتے بہت اچھے گذرے۔ کچّے مکان میں رہا۔ گھنے درختوں کے نیچے چارپائی پر بیٹھ کر چودھری نذیر اور اُن کے بھائیوں سے خوب باتیں کیں۔ اُن کی بیوی نے سرسوں کا ساگ پکایا اور اس کے ساتھ ہم نے مکھن سے لگی ہوئی مکّی کی روٹی کھائی، اُس پر لسّی پی۔ لُطف آگیا۔

میں نے کہا "چلئے کھانے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن دو تین ہفتے آپ وہاں کس طرح گذارتے ہیں؟

سوتے کہاں ہیں؟ صبح رفع حاجت کے لئے کہاں جاتے ہیں؟ نہاتے کہاں ہیں"؟

کہنے لگے "میں سب کے ساتھ چوپال میں ایک چارپائی پر سوتا ہوں۔ صبح کو رفع حاجت کے لئے دور کھیتوں میں لوٹا لے کر جاتا ہوں، اور مسجد کے ایک حصے میں نہا لیتا ہوں، یا کبھی نہر پر چلا جاتا ہوں۔

چانگیہ پہن کر وہاں خوب نہاتا ہوں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں سب لوگ پنجابی بولتے ہیں۔ میں پنجابی بول تو نہیں سکتا لیکن اس کے سننے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں کچھ عرصے میں اس زبان کو بول بھی سکوں گا۔ مشق کر رہا ہوں۔ یہ بڑی ہی جاندار زبان ہے۔ اس میں بناوٹ اور تصنع بالکل نہیں۔ یہ بے تکلفی کی زبان ہے۔ اس زبان کی یہی ادا مجھے سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے میں اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا ہوں"۔

میں نے یہ سب کچھ سُن کر میر صاحب کا یہ شعر پڑھا ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

فوراً بولے "جی ہاں! آج کل میں اسی عالم میں ہوں۔ اس غزل کا مقطع بھی سُن لیجئے ؎

غیرتِ یوسف ہے یہ وقت عزیز
میر اِس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

میں نے کہا "یہ شعر بھی آپ پر صادق آتا ہے"؟

کہنے لگے "دیکھئے! میں کتنا سعادت مند انسان ہوں"۔

اور یہ کہہ کر رسل نے اپنے مخصوص انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

ایک دفعہ رسل لاہور آئے تو اُن کے ساتھ ان کی ایک اطالوی شاگرد بھی تھی۔ یہ

لڑکی پاکستان اور ہندوستان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر کام کر رہی تھی۔

انہوں نے مجھ سے اس کا تعارف کروایا، اور کہا کہ "یہ لڑکی بہت اچھی طالب علم ہے۔ شہر تو اس نے دیکھے ہیں۔ میں اس کو یہاں کی دیہاتی زندگی سے آشنا کرنے کے لئے ساتھ لایا ہوں۔ اس کو میں کینیال لے جاؤں گا۔ یہ دو تین ہفتے وہاں رہے گی۔ چودھری نذیر سے ملے گی۔ اُن کی بھینس دیکھے گی، اُن کے اونٹ پر بیٹھے گی۔ اُس کے گھر کی عورتوں سے ملے گی۔"

میں نے کہا "خدا کے لئے اس کو کینیال نہ لے جایئے۔ وہاں یہ پریشان ہو جائے گی۔ لاہور کے آس پاس کے گاؤں اس کو دکھا دیتے ہیں۔ یہاں کی دیہاتی زندگی کا اس کو اندازہ ہو جائے گا۔"

لیکن انہوں نے کہا "اس کا کینیال جانا ضروری ہے۔ کم از کم دو ہفتے اس کو وہاں ضرور رہنا چاہیئے۔"

میں نے اس لڑکی سے کہا "تم کینیال ہر گز نہ جانا۔ وہاں تمہیں بہت تکلیف ہوگی۔"

اس نے کہا "رالف مجھے کینیال ضرور لے جانا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ پاکستان میں کینیال نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا۔ شہر تو سب ہی دیکھ لیتے ہیں۔ دور افتادہ دیہاتوں کی زندگی کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔"

چنانچہ وہ رسل کے ساتھ کینیال گئی اور دو ہفتے کے بعد واپس آئی۔

میں نے اُس سے پوچھا "کہو وہاں کینیال میں کیسی گذری؟"

اس نے کہا "آپ صحیح کہتے تھے۔ قیامت گذر گئی۔ کینیال تو دیکھ لیا۔ پاکستان کی دیہاتی زندگی بھی دیکھ لی۔ بارہ تیرہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ مجھے کچے مکان کے ایک بڑے کمرے میں پندرہ دن تک سونا پڑا۔ موٹی موٹی عورتیں رات بھر خراٹے لیتی تھیں، اُٹھ اُٹھ کر شیر خوار بچوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ مچھر کاٹتے تھے۔ روشنی کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ میں دو ہفتے سے رات کو سو نہیں سکی ہوں۔ نہانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کھانا بھی ایسا ملتا تھا جس کو کھانے کی مجھے عادت نہیں۔"

میں نے کہا "چلو رالف رسل کا مشن پورا ہو گیا۔ گاؤں کی زندگی تم نے دیکھ لی۔ میں نے تو سب کچھ تمہیں بتا دیا تھا۔ رسل تو "دیوانے" ہیں۔ دوسروں کو بھی دیوانہ سمجھتے ہیں اور کوئی دیوانہ نہ بھی ہو تو اُس کو دیوانہ بنا دیتے ہیں۔"

اُس نے کہا "میں رسل صاحب کے صبر و تحمل کی داد دیتی ہوں۔"

میں نے کہا "وہ تو قلندر آدمی ہیں۔ یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں۔ دُھن کے پکے ہیں۔ لیکن سب لوگ اُن کی طرح نہیں ہو سکتے۔ برسوں میں اُنہیں یہ آداب آئے ہیں۔"

چند روز وہ لڑکی ہمارے ہاں رہی تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا، اور اس کی صحت کچھ ٹھیک ہوئی۔

رسل ہندوستان اور پاکستان کی معاشرتی، تہذیبی، لسانی اور ادبی زندگی کے نہایت سنجیدہ اور مخلص طالب علم ہیں اور اس زندگی سے آشنا ہونے کے لئے یہاں کے شہروں اور دیہاتوں کی خاک چھانتے ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو یہاں کے رہنے والوں سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔

رالف رسل بڑے ہی محنتی آدمی ہیں۔ اپنا کوئی لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔ کبھی بیکار نہیں بیٹھتے۔ ہر وقت کام کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں تفریح نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کام ہی اُن کی تفریح ہے، اور یہ کام وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر کرتے ہیں۔ وہ مادی فائدے اور شہرت کی خواہش کے خیال سے کام نہیں کرتے۔ کام اُن کے نزدیک زندگی ہے اور زندگی کام سے عبارت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ وہ بہت کم آمیز انسان ہیں۔ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ اُن کے دوستوں کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن وہ دوستوں کے دوست ہیں۔ اُن کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اُن کا ذاتی کام تک کرتے ہیں۔

لندن کے دوران قیام میں انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، اور ہر معاملے میں میری مدد کی۔ اکثر مجھے اپنے گھر ہارلو نیوٹاؤن لے جاتے تھے جو لندن سے کوئی پچیس تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ دن دن بھر وہ میری خاطر مدارات کرتے تھے۔ اور اُن کے بچوں کے ساتھ

میرا اور میرے خاندان والوں کا وقت بہت اچھا گذرتا تھا۔ اُن کی بیگم مولی بھی ہم لوگوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اِن سب کی وجہ سے ہمارا وقت لندن میں بہت اچھا گذرا۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہم لوگوں کو دیارِ غیر میں ایک لمحے کو بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا، اور تقریباً چھ سال ہم لوگ اس شہرِ ناپرساں میں اس طرح رہے جیسے یہ ہمارا ہی شہر ہے، ہمارا وطن ہے۔

لندن سے مجھے لاہور آئے ہوئے تقریباً پچیس سال گذر چکے ہیں۔ لیکن رالف کی باتیں آج بھی مجھے یاد آتی ہیں۔ اُن کی محبّت اور خلوص بے پایاں کو میں آج بھی بھولا نہیں ہوں۔ ہم نے اس خلوص اور محبت کے سائے میں بہت اچھا وقت گذارا۔ یہ محبت اور خلوص یگانگت اور مفاہمت بہت سے لوگوں کے لئے قابلِ رشک تھی۔ ہم نے کئی سال تک ایک دوسرے کے ساتھ مِل جُل کر، نہایت خوشگوار ماحول میں کام کیا، اور اس سے، ہم دونوں کو بہت فائدہ ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا۔ آج بھی کہ، ہم ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں، لیکن محبت، یگانگت اور مفاہمت کا رشتہ ہمارے درمیان اسی طرح قائم ہے، جیسا کہ میرے قیام لندن کے زمانے میں تھا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ رالف کے ساتھ میرا جو وقت لندن میں گذرا ہے وہ میری زندگی کا بہترین زمانہ ہے۔

رالف رسل نہایت سادہ انسان ہیں۔ وہ درویشی اور قلندری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہوسِ زر اُن میں نام کو نہیں ہے۔ نمود و نمائش اور آرام و آسائش سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ انہیں لندن میں کبھی ذاتی مکان خریدنے کا خیال نہیں آیا۔ حالانکہ اُس زمانے میں مکان خریدنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ پروفیسروں کو مکان سو فی صد مارٹگیج (MORTGAGE) پر مِل جاتا تھا۔ وہ، ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہے۔ انہوں نے اپنے آرام کے لئے موٹر کار نہیں خریدی حالانکہ لندن میں موٹر کار خریدنا معمولی سی بات ہے۔ ہمیشہ بسوں، ٹرینوں اور ٹیوب میں سفر کرتے رہے اور دل کو اس طرح سمجھاتے رہے کہ اس طرح دورانِ سفر پڑھنے کا موقع مِل جاتا ہے۔

اُن کی زندگی کے یہ پہلو جب میرے سامنے آتے ہیں تو مجھے انگریزی کے اُس

جدید شاعر کا خیال آتا ہے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ شہر سے دور سمندر کے کنارے ایک جھونپڑی میں گذارا، اور جس نے چند سال ہوئے، اِس دُنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہ کہا تھا کہ مجھے زندگی میں تین چیزوں سے نفرت رہی ہے۔ایک تو ٹائپ رائٹر، دوسرے ریڈیو اور تیسرے موٹر کار اور موٹر ڈرائیونگ!

رالف رسل کی درویشانہ زندگی اور قلندرانہ شخصیت کم و بیش انہیں خیالات کی عملی تفسیر ہے۔

مارا اسیتپانیس

کوئی پچیس تیس سال پہلے غالباً ۱۹۶۱ء کی بات ہے، ایک دن میں اورینٹل کالج میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ باہر سے ایک نہایت دلکش سُریلی سی آواز آئی۔ ایک خاتون کسی سے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کا کمرہ یہی ہے"؟

کسی طالب علم نے جواب دیا "جی ہاں! یہی عبادت صاحب کا کمرہ ہے۔ وہ بیٹھے ہیں، لیکن اُن کے پاس جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ بے تکلفی سے اندر چلی جائیے"۔

یہ سُن کر ایک خاتون میرے کمرے میں داخل ہوئیں اور کہا "میں اندر آسکتی ہوں"۔

میں نے کہا "تشریف لائیے۔ تشریف رکھیئے"۔

اُنھوں نے کرُسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام مارا اسیتپانیس ہے۔ میں ماسکو سے آئی ہوں۔ وہاں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔ فلسفے کی طالب علم ہوں لیکن مجھے مطالعۂ پاکستان، علامہ اقبالؒ اور اُردو ادب سے دلچسپی ہے۔ آپ کو ایک زمانے سے جانتی ہوں۔ آپ کے مضامین پڑھے ہیں۔ اپنے اساتذہ سے بھی اکثر آپ کا ذکر سُنا ہے۔ میں آپ کو بھی اپنا اُستاد سمجھتی ہوں۔

کرُسی پر بیٹھنے سے قبل ہی انھوں نے یہ سب باتیں مجھے بتا دیں۔ شائستگی اور احترام کے

باوجود میں انہیں دیکھ کر کچھ حیران اور پریشان سا ہوا۔ کیونکہ اُن کی باتوں میں ایک طرح کا الھڑپن تھا۔ ایک عجب طرح کی بے باکی تھی، کچھ موانست کا احساس بھی تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے ساتھ برسوں کی شناسائی ہے۔

اُن کی عمر اُس وقت بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ سروقد، سرخ سفید رنگ، بھرا بھرا تندرست و توانا جسم، سفید قمیص میں ملبوس نیلے رنگ کی جین اور سفید قمیص، شگفتگی و شادابی اُن کے ایک ایک انداز سے پھوٹی پڑتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے واقعی کوئی کوہ قاف کی پری اُڑ کر لاہور آگئی ہے، اور میرے سامنے بیٹھی ہے۔

جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئیں تو میں نے پوچھا "آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟ آپ کا تعلق کوہ قاف سے تو نہیں ہے؟"

یہ بات میں نے تفنن طبع کے طور پر کہی تھی لیکن وہ فوراً سمجھ گئیں کہ کوہ قاف سے میرا مطلب کیا ہے۔

قدرے شرما کر بولیں "میں آرمینیا کی رہنے والی ہوں، اور آرمینیا بھی کسی طرح کوہ قاف سے کم نہیں ہے۔ میرے وطن کے لوگ خوش شکل، خوش مزاج اور وجیہہ ہوتے ہیں۔"

میں اُن کے اس بے باکانہ اندازِ گفتگو سے بہت محظوظ ہوا۔ اور دل ہی دل میں اُن کے اِس بے باکانہ اندازِ گفتگو کی داد دیتا رہا۔

پھر وہ کہنے لگیں "میں فلسفے کی کانفرنس میں شرکت کے لئے یو۔ ایس۔ ایس۔ آر اکیڈمی آف سائنسز کے وفد کے ساتھ حیدرآباد سندھ آئی تھی۔ چند روز وہاں گذارے، میں نے وہاں علامہ اقبالؒ کے فلسفے پر مقالہ بھی پڑھا۔ کانفرنس کے اجلاس چار دن تک ہوتے رہے۔ پرسوں اس کا اختتامی اجلاس تھا۔ میں کل ہی حیدرآباد سے لاہور آگئی۔ کانفرنس کے کچھ اور ڈیلیگیٹ بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔ میرے اساتذہ نے ماسکو میں مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ سے ضرور ملوں۔ چنانچہ میں بغیر اطلاع کے آگئی۔ اس جسارت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

میں نے کہا "آپ نے بہت اچھا کیا کہ بے تکلفی سے اورینٹل کالج آئیں۔ میرے پاس آنے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ مجھے آپ سے مِل کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ سے اچانک یہ ملاقات میرے لئے ایک خوبصورت تجربہ ہے۔ پھر آپ بہت اچھی اُردو بولتی ہیں۔ آپ کی اُردو سُن کر بھی جی خوش ہوا۔"

مارا نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ! میری اُردو تو ابھی بہت اچھی نہیں ہے۔ اگر کچھ عرصے لاہور میں رہنے کا موقع مِل جائے تو یقیناً میری اُردو اچھی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "آپ یہاں ضرور آیئے۔ اس یونیورسٹی اور اس کالج کے دروازے آپ کے لئے کُھلے ہوئے ہیں۔ سوویت یونین سے ہر سال چند طالب علم یہاں اُردو پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ ان میں طالبات کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ آپ بھی آسکتی ہیں۔"

کہنے لگیں "میرا کورس ماسکو میں مکمل ہو جائے تو میں ایک تعلیمی سال کے لئے یہاں ضرور آؤں گی۔ آپ سے استفادہ کروں گی۔ اورینٹل کالج میں تعلیم حاصل کرنا میرے لئے باعث فخر ہو گا۔"

میں نے کہا "ہم لوگ ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اُنھوں نے اپنے تھیلے میں سے کچھ کتابیں نکالیں، اور کہا "میں آپ کے لئے روسی ادب کی کچھ کتابیں لائی ہوں۔ یہ آپ کی نذر ہیں۔"

اِن میں گورکی، چیخوف، ٹُرجنیف، داستوسکی، مایاکافسکی، شولوخوف اور الیا اہرن برگ وغیرہ کی کتابیں تھیں جو ماسکو میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ یہ انگریزی زبان میں تھیں۔

میں نے کہا "آپ تو میرے لئے ادب کا بیش بہا خزانہ لے آئی ہیں۔ آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں! یہ کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ اس لئے میں انہیں شوق سے پڑھوں گا۔"

Professor Gankouvsky, L. R. Gordon Madame Polonskaya V. Moskalensto S. Levin, V. Kowpantsev, F. Tirnich.

کہنے لگیں "یہ میری طرف سے اور میرے اساتذہ کی طرف سے آپ کے لئے یہ حقیر سا تحفہ ہے۔"

میں نے کہا "آپ کو زحمت ہوئی ہوگی۔ ہوائی جہاز میں اتنی کتابوں کا بوجھ اُٹھا کر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ خاصی دُشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے۔"

کہنے لگیں "میرے لئے تو یہ عین راحت تھی۔ کیونکہ کتابوں کا یہ تحفہ آپ کے لئے تھا۔"
کوئی ایک گھنٹہ مارا استیپانیس میرے پاس بیٹھیں، اور باتیں کرتی رہیں۔ میں نے اُن کے لئے کافی منگوائی۔ وہ بڑے شوق سے کافی پیتی رہیں، اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ گھنٹہ سوا گھنٹے کے بعد اُنھوں نے کہا میں اب اجازت لوں گی۔ دن کے کھانے کے بعد فلسفہ کانفرنس کے دوسرے مندوبین کے ساتھ لاہور کی تاریخی عمارتیں دیکھنے کا پروگرام ہے۔ کل میں پھر آپ سے ملنے کے لئے آؤں گی۔ پرسوں مجھے ماسکو واپس جانا ہے۔

میں نے کہا کل آپ دس بجے کے قریب آجائیے۔ میں آپ کی مُلاقات اپنے طلبا اور طالبات سے بھی کراؤں گا۔ آپ سے مل کر اور آپ کی اُردو سُن کر اُنھیں خوشی ہوگی۔ طالب علم آپ سے کچھ سوالات بھی کریں گے، آپ کے جواب اور خیالات سُن کر انہیں خوشی ہوگی۔"

دوسرے دن دس بجے کے قریب اورینٹل کالج آنے کا وعدہ کر کے وہ اپنے ہوٹل چلی گئیں۔ دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر آئیں۔ میں نے اپنی طالبات اور کچھ طالب علموں سے اُن کی ملاقات کروائی۔ دلچسپ باتیں ہوئیں۔ سب اُن سے مل کر خوش ہوئے۔ کالج میں اچھی خاصی رونق ہوگئی۔ دو گھنٹے کی اس دلچسپ مُلاقات کے بعد ہم لوگوں نے اُنھیں رُخصت کیا۔ شام کو وہ ماسکو چلی گئیں۔ ماسکو سے اُنھوں نے مجھے مُفصل خط لکھا جس میں لاہور شہر کی تعریف، میری مہمان نوازی کا شکریہ اور اورینٹل کالج کی دلچسپ محفلوں کا ذکر تھا۔ میں نے اُن کے خط کا جواب لکھا، اور اس طرح کئی سال تک اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

اس عرصے میں اُنھوں نے ماسکو یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کی، اور وہیں وہ مشرقی فلسفے کے شعبے میں لیکچرار ہوگئیں۔ اس حیثیت سے اُنھوں نے پاکستان، علامہ اقبالؒ اور اسلامی تصوّف پر قابلِ قدر کام کیا۔ اُن کی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی دو کتابیں پاکستان میں

بھی شائع ہوئیں۔ ان میں
خاصی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کے تہذیبی، عمرانی اور فلسفیانہ مسائل پر بڑی خیال انگیز باتیں کہی گئی ہیں۔ اِن کے علاوہ وہ عالمانہ مقالے بھی لکھتی رہیں جو سوویٹ یونین کے علمی اور تحقیقی رسالوں میں شائع ہوئے، جن کی بدولت انہوں نے سوویٹ یونین کی علمی دُنیا میں اپنا مقام پیدا کرلیا، اور اُن کا نام جنوبی ایشیا پر کام کرنے والے سوویٹ دانش وروں پروفیسروں گین کاوسکی، مادام پولینیا سکا یاموسکالینکو، لیون کومپانٹسیف، اور ٹرپینخ وغیرہ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے پاکستان کے فلسفیانہ عمرانی اور تہذیبی مسائل کو ہمدردانہ اور دوستانہ زاویۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور پاکستان اور سوویٹ یونین کے تعلقات کو دوستی کی سطح پر لانے میں نمایاں کام کیا ہے۔

پاکستان کی تحریک، جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ثقافت، اِن مسلمانوں کے فلسفیانہ میلانات، سیاسی معاملات، ثقافتی روایات، علامہ اقبال کے نظریات اور اُردو زبان و ادب کے مختلف پہلو، مارا استیپانینس کی عالمانہ تحریروں کے خاص موضوعات ہیں، اور اُنھوں نے اِن کو پیش کرنے میں پاکستانی دانش وروں اور ادیبوں کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا ہے۔

مارا استیپانینس دوسری دفعہ جب ۶۵ء میں پاکستان آئیں تو میں اُس وقت لندن میں تھا۔ اس لئے اُن سے یہاں ملاقات نہ ہوسکی۔ لیکن جب میں لندن سے واپس آیا، اور میں نے اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ۱۹۷۲ء میں اس کالج کا جشن صد سالہ منایا اور اس سلسلے میں مشرقی علوم کی بین الاقوامی کانفرنس مُنعقد کی تو اُنہیں بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے اپنی یونیورسٹی کے خرچ پر لاہور آئیں، کئی دن یہاں قیام کیا، اور علامہ اقبالؒ کے فلسفیانہ اور عمرانی نظریات پر مقالہ پڑھا۔

مجھے اُن کے لاہور آنے کی اُمید کم تھی، کیونکہ وہ اس زمانے میں فن لینڈ کے دورے پر گئی ہوئی تھیں۔ لیکن واپسی پر جب اُنہیں اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کا دعوت نامہ ملا تو پاکستان آنے کے لئے تیار ہوگئیں۔ کراچی پہنچ کر اُنھوں نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ وہ شام

کو لاہور پہنچ رہی ہیں۔ ماسکو یونیورسٹی نے مجھے تمام اخراجات دیئے ہیں۔ ہوٹل کا خرچ تک میرے لئے منظور کیا ہے۔

میں نے شام کو ایئرپورٹ پر اُن کا استقبال کیا، اور نیو کیمپس میں اپنے گھر پر انہیں ٹھہرایا۔ گھر کے ماحول میں وہ بہت خوش رہیں۔

لاہور کے دوران قیام میں انہوں نے مجھے بتایا کہ "وہ کسی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے فن لینڈ گئی ہوئی تھیں لیکن پاکستان اور اورینٹل کالج کی محبت کی وجہ سے اس دورے کو مختصر کر کے وہ یہاں پہنچ گئیں۔ پاکستان کے سفر کے لئے گرانٹ منظور کروانے میں اُن کے شوہر نے بڑا کام کیا۔

میں نے اس کرم فرمائی کے لئے اُن کا شکریہ ادا کیا،

انہوں نے اورینٹل کالج کے جشنِ صد سالہ میں شرکت کی، مقالے پڑھے، اور لیکچرز بھی دیئے۔ اور لاہور میں اپنے علم اور جاذب نظر شخصیت سے لوگوں کا دل موہ لیا۔ ایک زمانے تک علمی ادبی محفلوں میں اُن کا چرچا رہا۔

کوئی ایک ہفتہ انہوں نے ہمارے ساتھ لاہور میں گذارا جب اورینٹل کالج کے جشنِ صد سالہ کی تقریبات ختم ہوئیں تو ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ "علمی کام تو ختم ہوا۔ اب میں ذرا بازار جانا چاہتی ہوں کچھ چیزیں خریدنی ہیں"۔

میں نے پوچھا کون کون سی چیزیں خریدیں گی؟

کہنے لگیں "میں کسی اچھے جیولر کی دوکان پر جانا چاہتی ہوں۔ دو ایک زیور میں اپنے لئے خریدوں گی اور ایک نیکلیس اپنی بیٹی کے لئے"۔

میں اُن کی یہ بات سُن کر حیران ہوا۔ کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک عالم اور فلسفی ہیں، اس لئے انہیں زیورات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوگی۔

چنانچہ میں نے اُن سے پوچھا کیا واقعی آپ زیورات سے دلچسپی رکھتی ہیں؟ آپ کو اِن کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے ایک شاعر آتش نے کہا ہے۔

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گُل میں گُل بوٹا کہاں ہے"

یہ شعر سُن کر وہ بہت محظوظ ہوئیں لیکن فوراً جواب دیا" یہ شعر بہت خوب ہے اور مجھ پر صادق بھی آتا ہے۔ علمی کام سے دلچسپی اپنی جگہ، لیکن میں بہرحال ایک عورت ہوں۔ اس لئے زیورات سے میری دلچسپی بالکل فطری بات ہے"۔

مجھے اُن کی اِن باتوں نے بہت لُطف دیا۔ چنانچہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ انہیں ایک جیولر کی دوکان پر لے گیا۔ وہاں اُنہوں نے کچھ زیورات خریدے۔ کانوں کی بالیاں، ہم نے بھی انہیں اپنی طرف سے خرید کر دیں۔ وہ ہماری مہمان تھیں۔ اس لئے میں نے یہ ضروری سمجھا اور کہا کہ "یہ ہماری طرف سے ایک معمولی سا تحفہ ہے۔ اس کو قبول کیجئے"۔

یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ وہ بالیاں اور دوسرے زیورات اُنہوں نے وہیں پہن لئے اور مسرت کا اظہار کیا۔

کہنے لگیں" اس قسم کے مشرقی انداز کے زیورات ہمارے ہاں نہیں ملتے ۔۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سوچا یہ چیزیں خرید لوں۔ پھر نہ جانے کب میرا پاکستان آنا ہو"۔

میں نے کہا" آپ نے یہ زیورات خرید کر اپنے عظیم انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انسان کو مشین نہیں بننا چاہیئے۔ اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی چیزوں سے بھی دلچسپی لے جو اُس کے شوق کی چیزیں ہوں"۔

اُنہوں نے میری اِن باتوں کو بہت پسند کیا۔ دوسرے دن وہ ماسکو روانہ ہوگئیں، اور وہاں سے اُنہوں نے مجھے ایک نہایت دلچسپ خط لکھا۔ اور یہ اطلاع بھی دی کہ وہ کچھ عرصے کے لئے اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا جا رہی ہیں جہاں وہ سوویٹ یونین کے سفارت خانے میں کونسلر یا سفیر کے فرائض انجام دیں گے۔ اُن کا قیام اوٹاوا میں رہے گا۔ اس طرح وہ کینیڈا اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کو بھی دیکھ سکیں گی اور مشرقی علوم پر جو کام وہاں ہو رہا ہے اُس سے انہیں آشنا ہونے کا موقع بھی مِلے گا۔

مارا استیپانیس ایک فلسفی، ایک ماہر عمرانیات اور ایک اقبالؒ شناس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخلص دوست، ایک دلکش شخصیت کی مالک اور ایک عظیم انسان بھی ہیں۔

اور یہی اُن کی، دلکش اور جاذبِ نظر شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ہے!

پروفیسر سوخاچیف

اورینٹل کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں میری خواہش تھی کہ پنجاب یونیورسٹی کے اس تدریسی اور تحقیقی ادارے کی بین الاقوامی شہرت نہ صرف برقرار رہے بلکہ میرے زمانے میں اس کی بین الاقوامی حیثیت میں کچھ اور بھی اضافہ ہو۔ چنانچہ میرے زمانے میں ایک منصوبے کے تحت اس ادارے کی بین الاقوامی شہرت میں اضافہ ہوا۔ دُنیا کے مختلف ملکوں سے پروفیسر اور طالب علم یہاں آئے، اور اُنہوں نے یہاں اُردو، فارسی اور اسلامی علوم پر کام کیا۔ فرانس، جرمنی، اٹلی، مصر، ایران اور جاپان کے پروفیسر وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اس ادارے کے ساتھ منسلک رہے اور اِن ملکوں کے طالب علم بھی اس ادارے میں اُردو زبان و ادب کے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے رہے۔ ان میں سوویٹ یونین کے طالب علم بھی تھے۔

اِن طلبار و طالبات میں سوویٹ یونین کی ایک لڑکی ایلینا ڈرگاچووا تھی جو ماسکو یونیورسٹی میں پاکستان کے انتظامی امور پر پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اپنے کام کے سلسلے میں مواد جمع کرنے کی غرض سے اور اُردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ یہاں ایک سال کے لئے آئی، اور اُس نے اورینٹل کالج میں رہ کر میرے ساتھ اُردو زبان اور ادب کا مطالعہ کیا۔ اسی کے ذریعے سے پروفیسر سوخاچیف سے میرا غائبانہ تعارف ہوا۔

ایک دن اُس نے مجھ سے پوچھا"کیا آپ پروفیسر سوخاچیف کو جانتے ہیں؟"۔
میں نے کہا"اُن کا نام تو میں نے سُنا ہے لیکن اُن سے میری مُلاقات نہیں ہوئی"۔
ایلینا نے کہا"پروفیسر سوخاچیف ماسکو یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد ہیں۔ بیشتر طالب علم وہاں انہیں سے اُردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ میں بھی اُن کی شاگرد ہوں۔ میرا موضوع تو پاکستان کا انتظامی ڈھانچہ ہے، اور میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔ لیکن اُردو زبان و ادب کی تعلیم میں نے پروفیسر سوخاچیف سے حاصل کی ہے، اور اب آپ کے پاس ایک سال کے لئے اُردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئی ہوں"۔
میں نے کہا"آپ تو اچھی خاصی اُردو بولتی ہیں۔ ماسکو میں رہ کر اتنی اچھی اُردو بولنا مشکل کام ہے"۔
اُس نے کہا"یہ سب کچھ سوخاچیف صاحب کی وجہ سے ہے۔ وہ بڑے ہی شفیق اُستاد ہیں، اور بڑی محنت سے اپنے طالب علموں کو اُردو پڑھاتے ہیں۔ اُن کی اُردو تو بہت ہی اچھی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ انہیں سے سیکھا ہے۔ اُنہوں نے بڑی شفقت اور محبت سے مجھے اُردو پڑھائی۔ ابھی تو میری اُردو زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اب ایک سال آپ کی شاگرد رہوں گی تو روانی سے اُردو بولنے لگوں گی"۔
ایلینا ایک سال میرے ساتھ رہی اور اُس نے اُردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ایک سال میں اُس کو اُردو بولنے کی خاصی مشق بھی ہو گئی۔
پروفیسر سوخاچیف کبھی پاکستان نہیں آئے۔ اسی وجہ سے میری اُن سے مُلاقات نہ ہو سکی۔ ۱۹۷۷ء میں اُن سے میری پہلی مُلاقات دِلّی میں جشنِ اقبالؒ کے موقع پر ہوئی۔
میں جشنِ اقبالؒ میں شرکت کے لئے پاکستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے دلّی گیا۔ ہم لوگوں کو فرید آباد کے ہالی ڈے اِن میں ٹھہرایا گیا۔ معلوم ہوا کہ اس ہوٹل میں روسی وفد بھی ٹھہرا ہوا ہے، اور اِس میں پروفیسر سوخاچیف، چیلی شیف، پروفیسر سیمیونوف اور مادام پالیانسکا شامل ہیں۔

ہم لوگ ابھی ہوٹل پہنچے ہی تھے، اور لاؤنج میں بیٹھے تھے کہ اوپر کی منزل سے سوخا چیف اور چیلی شیف نیچے کسی کام سے لاؤنج میں آئے۔

ہم لوگوں کو لاؤنج میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر سوخا چیف میرے پاس آئے اور کہا "عبادت صاحب! السلام علیکم" ۔ میرا نام سوخا چیف ہے۔ میں روسی وفد کے ساتھ جشن اقبالؒ میں شرکت کے لئے یہاں آیا ہوں۔

ماسکو یونیورسٹی میں اُردو پڑھاتا ہوں۔ یہ میرے رفیق کار چیلی شیف ہیں جو ماسکو یونیورسٹی میں ہندی کے پروفیسر اور مشرقی علوم کے ادارے کے ڈائرکٹر ہیں"۔

میں نے کہا "آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ چند سال ہوئے میری شاگرد ایلینا ڈرگا چووا نے لاہور میں آپ کا غائبانہ تعارف کروایا تھا۔ آپ سے مِلنے کی خواہش تھی۔ شُکر ہے کہ آج یہ خواہش پوری ہوگئی"۔

"میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کوئی دُشواری نہیں ہوئی کیونکہ اُردو کے رسالوں میں آپ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ میں آپ کو برسوں سے جانتا ہوں۔ آپ کے مضامین پڑھے ہیں۔ آپ کی کتابیں بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔ میں نے آپ کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ میرے طالب علم بھی ان تحریروں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور اِن سے استفادہ کرتے ہیں"۔

میں نے کہا "آپ کا شُکریہ کہ آپ میری تحریروں کو پڑھتے ہیں۔ ویسے اِن میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ تو طالب علمانہ کوشش ہے"۔

سوخا چیف کہنے لگے "اِن تحریروں میں خیال انگیز باتیں ہیں۔ اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں اِن سے مدد ملتی ہے"۔

میں نے کہا "اِن تحریروں میں اگر کوئی بات ہے تو یہ مُدرّسی کی دین ہے۔ میں اُردو زبان و ادب کا اُستاد ہوں۔ تقریباً چالیس سال میں نے اِس دشت کی سیّاحی میں گذارے ہیں۔ اُردو ادب کے طالب علموں کو دہلی یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی میں اُردو ادب پڑھایا ہے۔ اُن کی رہنمائی کی ہے، اور اُن سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ اُنہیں پڑھاتے ہوئے

بہت سے خیالات میرے ذہن میں آئے ہیں اور میں نے انہیں قلم بند کر دیا ہے۔ یہی میری تنقید ہے۔ جس میں پیش کئے ہوئے خیالات کو آپ خیال انگیز کہتے ہیں"۔

پروفیسر سُنحاچیف نے کہا "بہر حال آپ کی تحریروں کے محرکات کچھ بھی ہوں۔ ہم نے اِن سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ادب کے بہت سے مسائل کو سمجھا ہے۔ آپ سماجی پسِ منظر میں ادب کا جائزہ لیتے ہیں اور ادب کو ایک سماجی عمل سمجھتے ہیں جو انسانی اقدار کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ آپ ترقی پسند ہیں۔ انسان دوست ہیں۔ انسانی اقدار کے حامی ہیں۔ نو آبادیاتی نظام میں جو غلط اقدار معاشرے میں زہر گھولتی ہیں آپ اُن کے خلاف ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی تحریریں مجھے بہت عزیز ہیں۔ سوویٹ یونین میں اُردو کے اساتذہ اور طلباء آپ کی تحریروں سے گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمارے طالب علم آپ کے مداح ہیں، اور آپ کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ جو کچھ آپ لکھتے ہیں، جن خیالات کو اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں، وہ سمجھ میں آتے ہیں۔ ان میں کوئی اُلجھن اور اُلجھاؤ نہیں ہے"۔

میں نے کہا "یہ آپ کی محبت اور حُسنِ ظن ہے کہ آپ اور آپ کے طالب علم اِن تحریروں کو اہمیت دیتے ہیں"۔

پروفیسر سُنحاچیف نے کہا "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ کا علمی ادبی کام بہت پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے ہر صنف ادب کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ شاعری پر بھی لکھا ہے۔ افسانے اور ناول پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ کلاسیکی ادب اور جدید ادب دونوں آپ کے پیش نظر رہے ہیں"۔

میں نے کہا "یہ بھی مُدرّسی کی دین ہے۔ میں نے عرصۂ دراز تک اپنے طالب علموں کو اُردو ادب پڑھایا ہے۔ اس کے لئے ادب کی ہر صنف اور قدیم ادب اور جدید ادب دونوں کا مطالعہ ضروری تھا۔ میں نے ادب کے ایک سنجیدہ طالب علم کی طرح ادب کی مُختلف اصناف، اس کے مختلف پہلوؤں اور مختلف رجحانات کا مطالعہ کیا، اور تقریر و تحریر دونوں سے طالب علموں تک اس کو پہنچانے کی کوشش کی۔ بس یہی میری

تنقید ہے۔"

سوخاچیف نے کہا"ہم بھی اپنے طالب علموں کو پڑھانے میں آپ کی اِن تحریروں سے مدد لیتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ ادب کی مختلف اصناف اور ان اصناف کے علم برداروں پر اپنی تحریروں کو آپ نے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اب بھی آپ کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ آپ انہیں بھی کتابی صورت میں چھپوا دیجئے۔ ہم لوگوں کو اِن سے بہت فائدہ ہوگا۔ خاص طور پر آپ نے افسانے اور ناول پر جو کچھ لکھا ہے اس کو کتابی صورت میں یک جا کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔"

مجھے سوخاچیف صاحب کی یہ تجویز پسند آئی، چنانچہ گذشتہ سال میں نے ناول اور افسانے کے بارے میں اپنی تحریروں کو "افسانہ اور افسانے کی تنقید" کے نام سے شائع کر دیا۔ شاعری پر ایک کتاب "شاعری کیا ہے" بھی مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ اس میں شاعری، غزل، نظم پر اصولی بحثیں اور جدید شاعروں محمد علی جوہر، علامہ اقبالؒ، جوش ملیح آبادی۔ راشد وغیرہ پر تنقیدی مضامین ہیں۔

دِلّی میں سوخاچیف صاحب سے میری جو باتیں ہوئیں، اُن سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اُردو ادب کے نہایت سنجیدہ طالب علم ہیں، اور اُن کا مطالعہ وسیع ہے۔

کوئی ایک ہفتہ میں نے جشن اقبال کے موقع پر پروفیسر سوخاچیف کے ساتھ گذارا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ سوویٹ یونین میں اُردو ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ اساتذہ اور طلبا، بڑے شوق سے اُردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گذشتہ بیس پچیس سال میں وہاں اُردو ادب کے مطالعے کا خاصا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ ہمارے طالب علم بہت محنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی خاصی اُردو بول لیتے ہیں، اور اُردو ادب پر بھی اُن کی اچھی خاصی نظر ہے۔ افسوس ہے کہ وہاں ایسے لوگ نہیں ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ اسی لئے ہم لوگ اپنے بعض طالب علموں کو آپ کے پاس اورینٹل کالج میں بھیجتے ہیں تاکہ انہیں اُردو بولنے والوں کے ماحول سے استفادے کا موقع ملے۔ یہاں تھوڑا سا وقت گذارنے کے بعد اُن کی اُردو اچھی ہو جاتی ہے۔

اور اُردو ادب کے مطالعے کے شوق میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسی زبان کو سیکھنے، اُس کو روانی کے ساتھ بولنے اور اُس کے ادب کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اس زبان کے بولنے والوں کے ساتھ کچھ وقت گذارنا ضروری ہے۔ ہم اپنے طالب علموں کو کلاسیکی ادب اور جدید ادب دونوں پڑھاتے ہیں اور وہ پرانے شاعروں میں ولی، میر، سودا، میر درد، غالب اور مومن اور جدید شاعروں میں حالی، اقبال، جوش اور فیض سے دلچسپی لیتے ہیں۔

میں نے کہا اُس کا اندازہ تو مجھے آپ کے اُن طالب علموں سے ہوا ہے جو ایک تعلیمی سال کے لئے ہمارے ہاں آتے ہیں، اور اورینٹل کالج میں اُردو زبان و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایلینا ڈرگا چو وہ ایسی ہی ایک طالبہ تھی جس کی اُردو سے میں مُتاثر ہوا۔ وہ اُردو تو اچھی طرح بولتی ہی تھی۔ اُس کا ادب کا ذوق بھی نہایت عمدہ تھا۔ مطالعہ بھی خاصا تھا۔"

پروفیسر سوخا چیف یہ سُن کر خوش ہوئے، اور اُنہوں نے کہا کہ "مجھے خوشی ہے کہ آپ ہمارے شاگردوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔"

میں نے تھوڑی دیر کے لئے موضوع بدلا، اور اُن سے پوچھا کہ "جشن اقبال" کی اس کانگریس میں آپ کس موضوع پر مقالہ پڑھیں گے؟"

سوخا چیف نے جواب دیا "میں علامہ اقبال کی انسان دوستی کا قائل ہوں۔ میں اسی موضوع پر اپنا مقالہ پروفیسر سمونوف کی صدارت میں پڑھوں گا۔ میرے خیال میں اقبال بیسویں صدی میں دنیا کے سب سے بڑے انسان دوست شاعر ہیں۔ اُن کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ نو آبادیاتی نظام اور طبقاتی تفریق کے خلاف ہیں۔ میں نے اسی پس منظر میں اُن کی انسان دوستی پر چند خیالات پیش کئے ہیں۔ احترام آدمی اُن کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ اُن کے جذبات و احساسات اور افکار و خیالات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ بڑے ہی باشعور اور ترقی پسند شاعر ہیں۔"

غرض دِلّی کے دوران قیام میں کئی دن تک مجھے سوخا چیف اور چیلی شیف سے اس طرح کی باتیں کرنے کا موقع مِلا، اور مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ دونوں جنوبی ایشیا کی تاریخ و تہذیب کے نہایت سنجیدہ طالب علم ہیں۔ وہ پاکستان کو ایک عظیم ملک اور پاکستانی قوم کو ایک عظیم تہذیبی ورثے کا علم بردار سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے پاکستانی دانشوروں ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ محنت سے کیا ہے، وہ اُن کے مدّاح ہیں اور اپنی تحریروں میں اُن کی تصانیف کے حوالے دیتے ہیں، اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور یہ کہ وہ اُردو زبان و ادب کے لئے سوویٹ یونین میں لگن اور ذوق و شوق کے ساتھ تدریس و تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔ اُن کا مزاج تجزیاتی ہے اور وہ بڑے ہی مہذّب، شائستہ اور انسان دوست آدمی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے مِلنا اور اُن سے تبادلۂ خیال کرنا ہمیشہ ایک حسین اور خوش گوار تجربہ ہوتا ہے۔ دِلّی میں جشنِ اقبالؒ کے موقع پر پروفیسر سوخا چیف اور چیلی شیف سے میری ملاقاتیں ایسا ہی ایک تجربہ تھیں۔

آج بھی میں ان خوشگوار لمحوں کو یاد کرتا ہوں۔ جو دِلّی میں میں نے اُن کے ساتھ گذارے۔

آر۔ اِی۔ ڈی ٹیلبٹ

آر۔ ای۔ ڈی ٹیلبٹ انگریز تھے لندن کے رہنے والے تھے لیکن عمرِ عزیز کے تقریباً پچاس سال اُنہوں نے لاہور میں گذارے تھے۔ اِس لئے اسی شہر کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ زندگی بھر یہیں رہے۔ یہیں اُنہوں نے کام کیا، اور یہیں تقریباً پچاسی سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا، اور یہیں دفن ہوئے۔

زندگی کا زیادہ حِصہ انہوں نے کنڈا والا موٹر کمپنی لاہور میں مینیجر کی حیثیت سے گذارا۔ وہ نہایت خوش اخلاق، دیانت دار، محنتی، جفاکش اور فرض شناس انسان تھے۔ لوگوں کی خِدمت کرنا اُن کا نصب العین تھا۔ ضرورت مند لوگوں کی مدد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو چند منٹ میں حل کر دیتے تھے۔

میری اُن سے پہلی مُلاقات عجیب حالات میں ہوئی۔

میں جب ۱۹۶۶ء میں لندن سے لاہور واپس آیا تو ایک موٹر کار ماریس آکسفورڈ اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ گاڑی میں نے لندن میں بڑے شوق سے خریدی تھی، چند مہینے اس کو وہاں چلایا بھی تھا، اور پھر اُس کو اپنے ساتھ لاہور لے آیا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ لاہور آنے کے چند روز بعد ہی گل برگ میں اُس کو حادثہ پیش آیا، ایک لاپرواہ ڈرائیور نے ٹکر مار دی، اور اُس کے دائیں جانب کے دونوں دروازے اندر

کو دھنس گئے اور بیکار ہو گئے۔ کسی کو چوٹ تو نہیں آئی لیکن نئی موٹر کے حادثے سے دو چار ہونے کا مجھ پر بہت بُرا اثر ہوا۔ کسی نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کی مرمت کا کام کنڈ والا کمپنی میں کروایئے۔ وہاں مسٹر ٹیلبٹ مینجر ہیں۔ وہی یہ کام صحیح طور پر کروا سکتے ہیں۔ اُن کا تجربہ بہت ہے، اور وہ ایک اچھے انسان ہیں۔

چنانچہ میں اُن کے پاس مال روڈ پر کنڈا والا کمپنی میں گیا۔ حادثے سے متاثر ہونے والی کار انہیں دکھائی اور جس طرح یہ حادثہ پیش آیا تھا، اُس کی تفصیل اُنہیں سُنائی۔

ٹیلبٹ صاحب نے کار کو دیکھ کر اظہار افسوس کیا۔ غیر ذمہ داری سے موٹر چلانے والوں کی مذمت کی اور کہا "آپ موٹر میرے پاس چھوڑ دیجیئے۔ میں کوشش کروں گا کہ کچھ عرصے بعد کار آپ کو صحیح حالت میں مل جائے۔"

میں نے کہا "ٹوٹے ہوئے دروازوں کی مرمت میں تو بہت وقت لگے گا۔"

کہنے لگے "میں اِن دروازوں کی مرمت نہیں کرواؤں گا۔ نئے دروازے برٹش موٹرنگ کمپنی لندن (بی۔ام۔سی) کو لکھ کر امپورٹ کروں گا، اور گاڑی میں فٹ کروا دوں گا۔ آج ہی انہیں خط لکھ دوں گا۔ ہوائی جہاز سے دروازے آجائیں گے۔ اس کی قیمت انشورنس والے ادا کریں گے۔ میں خود اُن لوگوں سے بات کروں گا۔ اور ساری کاروائی کروالوں گا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

مجھے اُن کی یہ باتیں سُن کر اطمینان ہوا، اور میں یہ سوچتا رہا کہ یہ شخص کتنا ہمدرد ہے۔ اس کے مزاج میں کتنی باقاعدگی ہے، اور یہ انسانی مزاج اور اس کی کیفیات کا کتنا بڑا نباض ہے۔ ٹیلبٹ نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ مجھے کار کے اس حادثے سے جو جذباتی صدمہ پہنچا ہے، اس کا زخم کاری مندمل ہو جائے۔ واقعی اُن کی اس تجویز نے میرے زخموں کے لئے مرہم کا کام کیا۔

گاڑی میں نے اُن کے پاس چھوڑ دی، اور اطمینان سے گھر چلا آیا۔ دوسرے ہی دن سے ٹیلبٹ نے کام شروع کر دیا۔ بی۔ام۔سی کو خط لکھا۔ انشورنس کمپنی سے رابطہ قائم کیا، اور اس سلسلے میں مناسب کاروائی کی۔

چار پانچ ہفتے کے بعد ایک دن ٹیلبٹ صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ اُنہوں نے مجھے یہ اطلاع دی کہ برٹش موٹرنگ کمپنی والے نئے دروازے بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں، اور ایک ہفتے میں یہ دروازے لاہور پہنچ جائیں گے۔ انشورنس والے اِن کی قیمت ادا کریں گے۔ دو ہفتے میں آپ کی گاڑی تیار ہو جائے گی، اور آپ کو کوئی بِل ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ بِل انشورنس کمپنی ادا کرے گی"۔

اور واقعی میں دو ہفتے کے بعد کنڈ والا کمپنی میں گیا تو دیکھا گاڑی تیار ہے، اور اس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ گاڑی کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوئی ہے۔ بالکل نئی معلوم ہوئی۔

میں نے ٹیلبٹ کا شکریہ ادا کیا، اور گاڑی لے آیا۔

چلتے وقت ٹیلبٹ نے کہا "آپ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ میں پروفیسروں کی بڑی عزت کرتا ہوں، اور اُن کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کا کام خاطر خواہ ہو گیا۔ آپ کی خدمت میرا فرض ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بے تکلفی سے فون کیجئے یا میرے پاس گاڑی لے آئیے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی"۔

اس کے بعد ٹیلبٹ صاحب سے میرے تعلقات دوستی کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے تقریباً پچیس تیس سال اس دوستی کو نبھایا، اور جہاں تک گاڑی کا تعلق ہے، مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ مرتے دم تک وہ میری گاڑی کی دیکھ بھال کرتے رہے اور ہمیشہ مجھے اس سلسلے میں نہایت مفید مشورے دیتے رہے۔ کبھی کوئی زیادہ خرابی ہو جاتی تھی تو خود گھر پر آتے تھے، گاڑی ورکشاپ میں لے جاتے تھے اور ٹھیک کر کے گھر پہنچا دیتے تھے۔ بِل بعد میں ڈاک سے بھیجتے تھے۔

ٹیلبٹ صاحب بڑے ہی باقاعدہ آدمی تھے۔ صبح کو سات بجے وہ اپنی مورس آکسفورڈ سیلون میں کنڈا والا کی موٹر ورکشاپ میں آجاتے تھے، اور کام شروع کروا دیتے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں اُن کا دفتر تھا۔ وہ دفتر کا سارا کام خود کرتے تھے۔ صرف ایک اسسٹنٹ اُن کے پاس تھا جو حساب کتاب کا کام کرتا تھا۔ ایک بجے تک

وہ یا تو اپنے اس دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے یا پھر گاڑیوں کے کام کی نگرانی کرتے تھے۔ چار پانچ مستری کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ٹیلبٹ اُن کے کام کو دیکھتے اور اُن کی رہنمائی کرتے تھے۔ ایک بجے تک وہ اس طرح مصروف رہتے تھے پھر کھانا کھانے کے لئے اپنے گھر میو روڈ جاتے تھے۔ کھانے سے سے فارغ ہو کر ٹھیک دو بجے وہ پھر ورکشاپ میں آجاتے تھے، اور پانچ بجے تک اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے۔

اُن کی عمر اب ستر سال سے زیادہ ہو گئی تھی لیکن وہ جوانوں کی طرح دن بھر کام کرتے تھے۔ میں نے کبھی اُنہیں تھکا ہوا نہیں دیکھا۔ ہمیشہ چاق و چوبند اور کام میں مصروف نظر آئے۔

ایک دن میں نے اُن سے پوچھا "آپ صبح سے شام تک اس عمر میں مصروف رہتے ہیں۔ دن کو آرام بھی نہیں کرتے۔ آپ کو تھکن تو نہیں ہوتی؟"

کہنے لگے "میں دن کو بالکل آرام نہیں کرتا۔ دن بھر کام کرتا ہوں۔ اس سے مجھے ایک عجیب طرح کی طمانیت، نصیب ہوتی ہے۔ میری صحت اور چاق و چوبند رہنے کا راز بھی یہی کام ہے۔ مصروفیت انسان کے لئے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ انسان کا وقت اچھا گذرتا ہے، اور وہ مُستعد (ACTIVE) رہتا ہے۔"

ٹیلبٹ اپنے ماتحتوں کے ساتھ خندہ پیشانی اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ساتھ کام کرنے والے اُن سے محبت کرتے تھے، اور اُن کے ساتھ احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اُن کا ماحول نہایت خوش گوار تھا۔

ٹیلبٹ علمی آدمی نہیں تھے لیکن علمی معاملات سے انہیں دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی مجھ سے مذہب کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ کبھی اخلاق پر گفتگو کرتے تھے۔ کبھی زبان کے بارے میں اظہار خیال کرتے تھے۔ انگریزی اُن کی مادری زبان تھی لیکن اُردو بھی بول لیتے تھے، اور میں جب بھی اُن کے پاس جاتا تھا، وہ اردو زبان کی ساخت کے بارے میں دو چار سوال مجھ سے ایسے کرتے تھے کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔ اُن کے سوالوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی تھی کہ اُنہوں نے اُردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے، اور وہ اس زبان کے بعض بُنیادی مسائل کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں اُن کے سوالوں کا جواب تفصیل سے دیتا تھا تو وہ

میری باتوں کو سُن کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مذہب سے انہیں دلچسپی تھی۔ وہ عیسائی تھے، اور لاہور کی مسیحی برادری سے اُن کا رابطہ تھا۔ وہ اِن لوگوں کے لئے فلاحی کام بھی کرتے تھے۔ اسلام سے بھی انہیں دلچسپی تھی، اور اسلامی تصوّف کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ خاص طور پر تصوف میں انسان دوستی کی جو فضا تھی، اُس کے وہ شیدائی تھے۔ کیونکہ خود بھی انسان دوست تھے۔ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو عفو و درگذر سے کام لیتے تھے۔ صوفیائے کرام کی اُن کے دل میں بڑی عزّت تھی اور وہ بڑی عقیدت اور محبت سے اُن کے روحانی اور انسانی کارناموں کا ذکر کرتے تھے۔

کنڈا والا کی ورکشاپ کے اندر کسی صوفی بزرگ کا مزار تھا۔ ٹیلبٹ اِس مزار کا خاص خیال رکھتے تھے۔ سال میں ایک دفعہ عُرس کے موقع پر ٹیلبٹ دیگیں پکواتے تھے، نذر نیاز ہوتی تھی، اور وہ بڑے اہتمام سے اپنے رفیقوں اور دوستوں کو یہ کھانا کھلاتے تھے۔ اس موقع پر اُن کی ورکشاپ میں جشن کا سا سماں ہوتا تھا۔

کہتے تھے "ہم لوگ بڑی عقیدت سے عُرس کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہم سب پر اِن بزرگ کا سایہ ہے۔ اِن کی بڑی برکت ہے۔ اِن کے کرم کی بہ دولت ہمارے تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں۔ بزرگانِ دین کے کرم سے زندگی کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔"

اور میں اُن کی یہ باتیں سُن کر خوش ہوتا تھا، اور کہتا تھا "واقعی بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اُن کے ساتھ روحانی وابستگی، مادّی زندگی کے بھی بے شمار مسائل کو حل کر دیتی ہے، اور ان کی وجہ سے انسان کو تحفظ اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس انسان کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔"

مسز ٹیلبٹ اپنی بیگم کے ساتھ میو روڈ پر رہتے تھے۔ اُن کی بیگم بھی کبھی کبھی ورکشاپ میں آجاتی تھیں میری اُن سے کئی دفعہ مُلاقات ہوئی۔ وہ ٹیلبٹ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ تنہائی کا احساس دونوں کو تھا۔ کیونکہ اُن کے بچے پاکستان سے باہر تھے۔ کوئی لندن میں،

کوئی سعودی عرب میں تو کوئی یونان میں ۔ ٹیلبٹ اُن کا ذکر بڑے جذب و شوق کے ساتھ کرتے تھے۔ اُن کی بیگم بھی اپنے بچوں کو بہت یاد کرتی تھیں۔ اور اکثر جب بھی اُن کا ذکر ہوتا تھا تو ان دونوں پر رقّت طاری ہو جاتی تھی۔ خاصے جذباتی لوگ تھے۔

ایک دن مسز ٹیلبٹ مجھ سے کہنے لگیں۔ "ٹیلبٹ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ اپنے فرائض بڑی جاں فشانی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں لیکن گھریلو زندگی میں خاصے لاپروا ہیں۔ بچوں کی طرح مجھے ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ واقعی یہ اپنی ذاتی زندگی میں بالکل بچّے ہیں، اور جیسے جیسے اِن کی عمر بڑھ رہی ہے، بچوں کی سی کیفیت اِن میں زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ویسے یہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ تقریباً نصف صدی ہم نے ایک ساتھ گذاری ہے۔ ہماری محبت روز افزوں ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ کسی شخص میں بچوں کا سا مزاج ہونا بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ بچوں میں معصومیت اور سادگی ہوتی ہے، اور میرے خیال میں یہ دونوں باتیں انسان کا زیور ہیں۔ آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے معصوم شخص کے ساتھ نصف صدی پوری کرلی ہے آپ کی زندگی قابلِ رشک ہے۔"

کہنے لگیں "ٹیلبٹ میں دلسوزی بہت ہے۔ انسان دوستی بہت ہے۔ یہ کسی شخص کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے۔ کسی کو پریشانی میں دیکھتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں اور مہینوں پریشان رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "اِسی لئے تو میں ٹیلبٹ صاحب کا عاشق ہوں۔ میرے مزاج کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔"

غرض دیر تک ہم لوگ اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ جب بھی اُن سے میری مُلاقات ہوتی تھی تو ہم اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔

تقریباً پچیس تیس سال میرا مسٹر ٹیلبٹ کے ساتھ رابطہ رہا، اور میں نے ہمیشہ انہیں محبت، خِدمت اور انسان دوستی کے جذبات سے سرشار دیکھا۔ یہی اُن کی شخصیت کی سب سے اہم خصوصیت تھی۔

میں ۱۹۸۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت مکمل کر کے اُردو کے پروفیسر اور اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ ایک دن اُن کی ورکشاپ میں گیا، اور انہیں یہ خبر سنائی تو بہت اُداس ہوئے۔

کہنے لگے "پروفیسر کو کبھی ریٹائر نہیں ہونا چاہیئے۔ ابھی تو آپ کی عُمر بھی ایسی نہیں ہے کہ ریٹائر ہوں"۔

میں نے کہا "میری عمر کاغذات میں کچھ زیادہ لکھی ہوئی ہے۔ اس لئے چند سال قبل ریٹائر ہو گیا۔ لیکن میرے حق میں یہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ اب میرے پاس وقت زیادہ ہو گا، اور میں یکسوئی سے علمی کام کر سکوں گا"۔

اُنہوں نے کہا "جی ہاں، پروفیسر کے ریٹائر ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہے"۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے چائے منگوائی، مجھے چائے پلائی۔ پھر اپنے چند رفقاء کو بُلایا، اور اُن سے کہا کہ "پروفیسر صاحب اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ ان کے کام کا بل کم سے کم ہونا چاہیئے۔ اگر کسی چیز کی ان کے موٹر کے لئے ضرورت ہو تو نئی خریدنے کی بجائے بلال گنج سے لائیے تاکہ خرچ زیادہ نہ ہو۔ پروفیسر صاحب کا خاص خیال رکھئے"۔

میں ٹیلبٹ کی اِن باتوں سے بہت متاثر ہوا، اور یہ سوچتا رہا کہ یہ شخص کتنا عظیم انسان ہے اور یہ اپنے دوستوں کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

ٹیلبٹ واقعی ایک عظیم انسان تھے، اور یہی اُن کی سب سے بڑی خوبی تھی!

پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
کی
نئی کتابیں
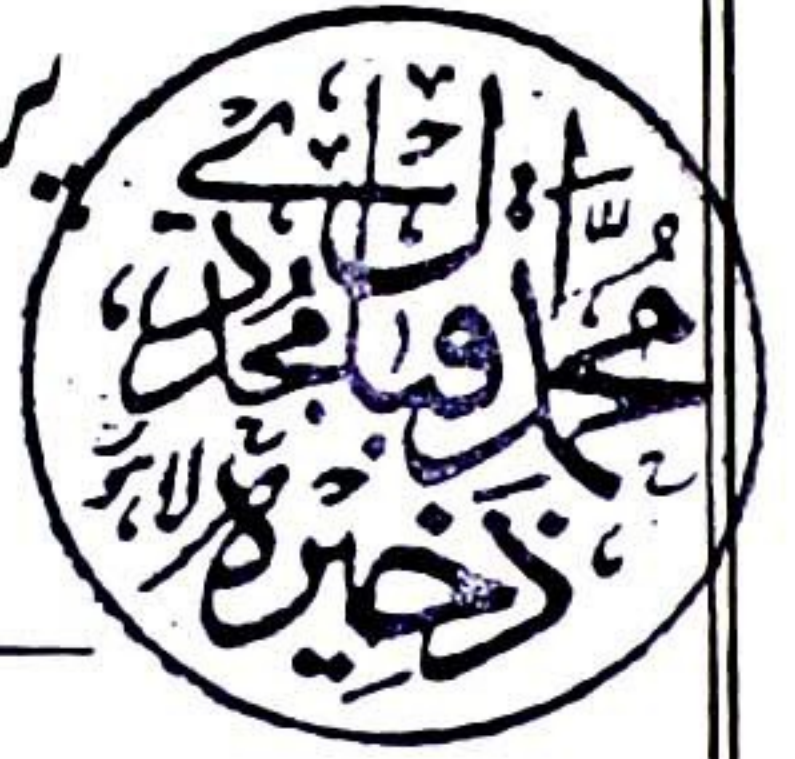
۱۔ ولی اورنگ آبادی
۲۔ میر تقی میر
۳۔ حضرت خواجہ میر دردؒ
۴۔ نالۂ درد (اُردو ترجمہ)
۵۔ جہانِ میر
۶۔ جہانِ غالب
۷۔ غالب کا فن
۸۔ ادب اور ادبی قدریں
۹۔ تنقید اور اُصولِ تنقید
۱۰۔ خطوط عبدالحق
۱۱۔ سیاحت نامہ نواب کریم خاں
۱۲۔ آزادی کے سائے میں (۱۹۴۷ء کے حالات)
۱۳۔ پاکستان کے تہذیبی مسائل
۱۴۔ سحر البیان تنقیدی مطالعہ
۱۵۔ جشن اقبالؒ نئی دہلی (سفرنامہ)
۱۶۔ ترکی میں دو سال (سفرنامہ)
۱۷۔ دیارِ حبیبؐ میں چند روز (سفرنامہ)
۱۸۔ رہ نوردانِ شوق (خاکے)
۱۹۔ آوارگانِ عشق 〃
۲۰۔ جلوہ ہائے صد رنگ 〃
۲۱۔ یادِ عہدِ رفتہ (خود نوشت)
۲۲۔ یارانِ دیرینہ (خاکے)
۲۳۔ غزالانِ رعنا 〃
۲۴۔ شجر ہائے سایہ دار 〃
۲۵۔ دیوانِ ولا
۲۶۔ دیوانِ فارسی، خواجہ میر دردؒ
۲۷۔ شاعری کیا ہے؟
۲۸۔ صنفِ غزل کے بنیادی اُصول،
۲۹۔ بلاکشانِ محبت
۳۰۔ اورینٹل کالج میں تیس سال
۳۱۔ آہوانِ صحرا (زیرِ طبع)

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادب و تنقید، ۸۸۔ این، سمن آباد، لاہور